مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۰ | جمادی الاولی سنہ ۱۴۴۰ھ | فروری ۲۰۱۹ء | شمارہ ۲

آداب التبلیغ

دعوت و تبلیغ کے آداب

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے
زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049
پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

آداب التبلیغ (دعوت وتبلیغ کے آداب)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	نوعیت مضمون	۷
۳	تعین مضمون	۸
۴	دعوت میں کوتاہی	۹
۵	آدابِ دعوت	۱۳
۶	طرز دعوت	۱۵
۷	دعوت اور منازعت	۱۶
۸	صلح کل	۱۸
۹	عرفی تصوف	۱۹
۱۰	مرزا بیدل کی اصلاح	۲۰
۱۱	حاکمانہ جواب	۲۲
۱۲	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات	۲۳
۱۳	حضرت تھانوی کا مسکت جواب	۲۵
۱۴	جواب کے مختلف انداز	۲۶
۱۵	مولانا یعقوب صاحب کی حکایت	۲۷
۱۶	تدریس میں نیت تبلیغ	۲۹
۱۷	ضرورت مدارس	۲۹
۱۸	درس وتدریس میں تبلیغ کی نیت	۳۰
۱۹	اخلاص نیت کا امتحان	۳۱
۲۰	لفظی وخیالی نیت	۳۲
۲۱	شبہ کا جواب	۳۲
۲۲	اقسام تبلیغ	۳۳
۲۳	طلباء اور تبلیغ	۳۵
۲۴	درجات تبلیغ	۳۵

۲۵	جاہل مبلغ	۳۶
۲۶	ہر فرد امت کے ذمہ دعوت	۳۹
۲۷	طریق دعوت	۴۰
۲۸	ضرورت ترغیب وترہیب	۴۲
۲۹	شفیق کی تعلیم	۴۲
۳۰	رعایت مخالف	۴۳
۳۱	باریک ادب	۴۴
۳۲	شفقت میں غلو کا نتیجہ	۴۵
۳۳	مسلمات سے جواب	۴۸
۳۴	تبلیغ میں اہل بصیرت سے رائے	۴۹
۳۵	تبلیغ میں خودرائی	۵۰
۳۶	باطل کے مقابلہ میں تبلیغ	۵۲
۳۷	ردمرزائیت کی ضرورت	۵۳
۳۸	ثمرہ تبلیغ	۵۴
۳۹	ترجمہ قرآن کریم میں احتیاط	۵۵
۴۰	دعوت وتبلیغ کا طریق	۵۶
۴۱	دعاء کرنے کا ادب	۵۷
۴۲	مقصود تبلیغ	۵۸
۴۳	ثمرات پر نظر ہونے کا نقصان	۵۸
۴۴	گناہ کا وسوسہ آنا نقصان دہ نہیں	۵۹
۴۵	غلو مجاہدہ کا نقصان	۶۰
۴۶	عبدیت کا تقاضیٰ	۶۰
۴۷	حصول مقصود	۶۱
۴۸	فنائے ارادہ	۶۲
۴۹	خلاصہ کلام	۶۲
۵۰	اخبار الجامعہ	۶۶

وعظ

آداب التبلیغ

(دعوت وتبلیغ کے آداب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آداب التبلیغ سے موسوم یہ وعظ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی درخواست پر دارالعلوم دیوبند میں بروز جمعرات ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ کو ہوا۔ جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ تک جاری رہا۔ کرسی پر بیٹھ کر حضرت والا نے بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ جو زیادہ تر علماء اور طلباء تھے۔ مولانا اطہر علی صاحب سلہٹیؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

(حضرت فرماتے ہیں) تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسائل سن کر عالم ہوگیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لیے معین کیا ہو۔

چنانچہ صحابہؓ نے کہاں پڑھا تھا؟ وہ بھی تو سن سن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوگیا ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے کہ تم قابل ہو۔ بقول ایک حکیم کے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

دعوت وتبلیغ سے متعلق حکیم الامت کا یہ بہت بہترین وعظ ہے جس میں تبلیغ کرنے کے آداب اور طریقے ذکر کئے اور اقسام تبلیغ کو بیان کیا اور بتایا کہ اگر کسی بھی شعبہ سے آدمی وابستہ ہے تو وہ فریضہ تبلیغ ادا کر رہا ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت صحیح ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۹/۱۰/۲۰۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم أما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

{ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ }(۱)

نوعیت مضمون

جس مضمون کو اس وقت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ کوئی نیا مضمون نہیں۔ مگر ایک اعتبار سے نیا بھی ہے یعنی اصل وحقیقت کے اعتبار سے تو جدید(۲) نہیں ہاں عارض کے اعتبار سے جدید ہے یعنی واقعہ میں تو یہ پرانا ہے مگر اس کا جو مقتضا تھا اس میں آج کل کمی ہے اس کمی کو دور کرنے اور اسکے حقوق کما ینبغی پر آگاہ کرنے کے لیے یعنی جس درجہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے تھا اور آجکل وہ نہیں ہے اس اعتبار خاص سے جدید بھی کہا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس کے تعین سے معلوم ہوجائے گا کہ اس میں آج کل کس قدر کمی ہے اور حقیقت میں اس میں کیسا اہتمام ہونا چاہیے تھا اور ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون

(۱) ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مؤعظہ حسنہ کے ساتھ بلایئے اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہوتو) ان سے مجادلہ بھی کیجئے مگر احسن طریقہ سے، بے شک (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب خوب جانتا ہے کہ کون راہ راست سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے'' سورۃ النحل: ۱۲۵ (۲) نیا۔

ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک اعتبار سے جدید ہونا مضر(۱) بھی ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا، جو بدعت ہواور دین سے خارج اور زائد ہواور جو پہلے سے دین کا جزو ہو وہ تو قدیم ہی ہوگا۔ لہٰذا انتظار مضمون جدید کا علی الاطلاق(۲) تو غلطی ہے مگر عام لوگوں کا طبعاً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیے، کیونکہ اس میں جی لگتا ہے اس مصلحت کا لحاظ فی الجملہ کر کے جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں گونہ جدت ہو(۳) تو اچھا ہے۔خواہ جدید اس اعتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل معلوم ہی نہیں ہوا۔ یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو(۴)۔ یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی۔ اس لیے بیان میں اس جدت خاص کے اعتبار سے اس کی رعایت کی جاتی ہے کہ کوئی نیا مضمون ہو۔ ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں۔حتی کہ اگر کسی قسم کی جدت بھی نہ ہو، خواہ بالذات یا بالعرض، بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ جب کسی قسم کی بھی جدت نہیں۔تو اس بیان سے کیا فائدہ۔ یہ تو تحصیل حاصل ہے۔سو یہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر اور کچھ فائدہ نہ ہو تو مکرر کرنے سے تاکید ہی ہوجائے گی اور تاکید کا مفید ومؤثر ہونا علم بلاغت میں ثابت ہے۔تو یقیناً تکرار سے ایک نیا نفع ہوگا۔ یعنی تاکید کا اثر، جو کہ قبل از بیان نہیں تھا تو یہ کیا تھوڑا فائدہ ہے۔تو تحصیل حاصل کہاں ہوئی۔ بلکہ یہ تو تحصیل غیر حاصل ہے مگر تاہم عموماً طبعی اقتضاء یہ ہے کہ ایسی بات بیان ہو جو پہلے سے بالکل ذہن میں نہ تھی۔خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی مگر اس سے ذہول(۵) ہوگیا تھا۔اس کی طرف توجہ نہ تھی تو اس طبعی اقتضاء کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے کہ مضمون میں گونہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تعین مضمون

چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ کیا گیا ہے۔اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے۔اب اس کو متعین کرتا ہوں۔اہل علم کو تو آیت کی تلاوت ہی سے اس مضمون کی تعیین ہوگئی ہوگی۔ کیونکہ مجمع اہل علم کا ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض لوگ

(۱) نقصان دہ (۲) مطلقاً جدید مضمون کا انتظار میں رہنا (۳) ایک حیثیت سے نیا پن ہو (۴) اب تک اس کی طرف توجہ نہیں تھی اس لیے جدید معلوم ہوتا ہے (۵) ذہن سے نکل گئی تھی۔

جو اہل علم نہیں، نہ سمجھے ہوں ان کو ترجمہ کرنے سے معلوم ہوجائے گا۔ اس لیے ترجمہ کرتا ہوں۔ تا کہ ان کے نزدیک بھی متعین ہوجائے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: { اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ }(۱) ترجمہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ کیا مضمون بیان کرنا ہے۔ وہ مضمون خدا کے سبیل کی طرف بلانے کا ہے۔ خدا کا سبیل (۲) کیا ہے، سبیل رب وہ ہے، جس سے ان تک رسائی ہوجائے۔

اور ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اگر انسان اسلام کے احکام بجالاتا ہے تو اس کو ان تک رسائی ہوسکتی ہے اور یہی سبیل رب ہے۔ اسی طرح لوگوں کو بلانے کا حضور کو امر (۳) ہوا ہے اور اسلام کے اندر احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک اصولی، ایک فروعی، لفظ سبیل دونوں کو عام ہے(۴) مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو اصول کی بھی دعوت دیجئے اور فروع کی بھی۔ تو خلاصہ یہ نکلا کہ اصول اور فروع پر بلا کر ان کو اسلام کی طرف بلائیے۔ باقی دعوت کا ایک طریقہ ہے۔ وہ اس کے متعلقات سے ہے۔ یعنی اس کے آداب ولوازم جن کا ذکر اپنے موقع پر آجائے گا۔ مگر تعین مضمون کے واسطے اتنا ہی کافی ہوگیا۔ کہ وہ مضمون اسلام کی طرف بلانا ہے اور اسلام ہی دین حق ہے۔ وہی سبیل رب ہے، وہی صراط مستقیم ہے یہ اس کے القاب ہیں۔

دعوت میں کوتاہی

اور ظاہر ہے کہ گو یہاں ادع کا خطاب حضور کو ہے۔ مگر حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ رسول اور اتباع رسول سب اس کے مخاطب ہیں۔ ہاں حضور کو خطاب اولاً ہے۔ اور دوسروں کو ثانیاً۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس حکم کی طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔

---

(۱) ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مؤعظہ حسنہ کے ساتھ بلائیے اور (اگر مجادلہ کی ضرورت ہو تو) ان سے مجادلہ (بھی) کیجئے۔ مگر احسن طریقہ سے ہو'' سورۃ النحل: ۱۲۵ (۲) خدا کا راستہ (۳) حکم (۴) دونوں کو شامل ہے۔

اعتقاداً تو اس کو مامور بہ (۱) سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر اس میں بھی غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے، اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن، اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ (۲) کے خلاف نہ ہو ورنہ وہ بھی ندارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب کہا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگادی کہ اس مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں محض اپنے اغراض کے سبب کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ یہ اس کے بھی موافق ہیں یا نہیں۔ اگر ہوا فبہا ورنہ (۳) کھینچ تان کر اس کو اغراض کے تابع بناتے ہیں اور اغراض کو متبوع یعنی پہلے اغراض تجویز کر لئے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف۔ پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی، کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے، لہٰذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ بھی نہیں سمجھتے۔ بلکہ عجب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ (۴) بتلانے لگیں۔ افسوس! مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سرانجام پاجائے، پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، مگر افسوس! یہ نہیں کرتے۔ بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لیے دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے توجہی کی کہ اس میں اپنی اغراض کی وجہ سے بے حد تساہل (۵) کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی اور ایسے بہت نکلیں گے۔ تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہہ دیں کہ صل فانک لم تصل۔ (نماز پڑھ بے شک تو نے نماز نہیں پڑھی)۔

اور اس کی وجہ صرف اتباع ھویٰ ہے۔ اس لیے باوجود علم کے محض رکیک (۶) تاویلیں گھڑ لیتے ہیں۔ مگر خدا کے ساتھ حیلہ وتزویر چل نہیں سکتا۔ (۷)

(۱) اس بات کا اعتقاد تو ہے کہ تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے (۲) اشارہ ہے پرستاران تحریکات جدیدہ کے معاملات کی طرف ۲۲۔ منہ (۳) تو ٹھیک ہے (۴) یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے کہ جس کام کا حکم دیا گیا ہو اس کو ممنوع قرار دیدیں (۵) سستی (۶) نامناسب تاویل کر لیتے ہیں (۷) اللہ کے سامنے حیلے بہانے نہیں چلتے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ۔(۱) اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ وکعبہ بنا رکھا ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیوی اغراض فوت ہوتے ہیں۔ دوستی نہیں رہے گی، میل ملاپ نہ رہے گا، ہنسی خوشی جاتی رہے گی۔ اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہوجائے گا۔ پھر ناخوش ہوکے آزار(۲) کے درپے ہوجاوے گا۔ پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی محض ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کرلو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آویں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں ان سے پوچھو کہ کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں (۳)۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لیے کوئی شرط وضابطہ ہی نہیں ہے اور ضرور ہے مگر شرائط وضوابط وآداب واعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگالیا کہ ہم تو معذور ہیں۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط وآداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کرلیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط وضوابط پوچھنے کا وہ اگر آداب واعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلایا جاوے گا۔ باقی حالت موجودہ میں جب کہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں۔ اس حالت میں آپ کو اعذار وشرائط پوچھنے اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں۔ جو شخص کام کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اس کو نہ شرائط وضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب واعذار پوچھنے کا کوئی حق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط واعذار اس لیے تلاش کرے گا تاکہ امر بالمعروف (۴) کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جاوے۔ جب اعذار معلوم ہوجائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا۔ کہ مجھ میں یہ یہ عذر موجود ہیں، یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں۔ ہم کیسے امر بالمعروف کریں۔

اس لیے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار وشرائط بتلایا ہی نہ

---

(۱) ''بلکہ انسان اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے'' سورۃ القیامۃ: ۱۴، ۱۵
(۲) تکلیف پہنچانے کی کوشش کریگا (۳) کونسی حالت امر بالمعروف کو ساقط کردیتی ہے (۴) اچھائی کا حکم نہ کرنا پڑے

کریں۔ جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط کیا ہیں۔ اس کے اعذار وموانع کیا کیا ہیں۔ ایسے شخص کو شرائط واعذار نہ بتانا چاہیے۔ ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ(۱) کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو۔جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جاوے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا، وہ پوچھے تو اس کو بے شک بتلایا جاوے۔لیکن اگر یہ معلوم ہوجاوے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے۔ بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار وموانع کی اطلاع کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ یاد رکھو! ہر سائل کو یکساں جواب دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کا حال برابر نہیں۔

مجھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جواب بہت پسند آیا۔ ایک دن درس میں یہ حدیث آئی کہ: من صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہٖ۔ الیٰ اٰخرہٖ(۲)۔

کہ جو شخص ایسی دو رکعت نماز پڑھے جن کی طرف سے دل متوجہ ہوکر حدیث نفس اور وسوسہ خطرہ عمداً بالکل نہ لاوے تو اس کے تمام گناہ معاف ہوجاویں گے۔ ایک طالب علم نے کہا، حضرت اس طرح نماز پڑھنا ممکن بھی ہے؟ نماز میں تو خیالات بہت ہی آتے ہیں۔

فرمایا تجھ کو شرم نہ آئی یہ سوال کرتے ہوئے۔ ارے کبھی اس کا قصد بھی کیا تھا جو محال نظر آتا ہو۔ بس پہلے ہی پوچھنے بیٹھ گئے۔ میاں کبھی ارادہ بھی تو کیا ہو۔ خدا کے بندے پہلے کرتے پھر پوچھتے۔ کہ ہم نے کیا تھا مگر نہ ہوا۔ تو واقعی یہ جواب نہایت حکیمانہ وبزرگانہ ہے۔ واقعی جواب محض منطقیانہ نہ ہونا چاہیے بلکہ حکیمانہ جواب بھی دینا چاہیے۔ اس سے اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کے ارشاد سے نفع یہ ہوا کہ سائل کو تنبہ ہوا۔ اپنی غلطی پر اسے ندامت وخجلت ہوئی۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ شرائط علماء سے پوچھنا جائز بھی ہے اور ان کو بتلانے سے بھی انکار نہیں۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ مستفتی کون ہے (۳)۔ آیا وہ

(۱) وہ تو ایسی صورتیں تلاش کرے گا کہ جس میں نماز ساقط ہوجائے (۲) لم أجدا لحدیث فی موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی شریف (۳) پوچھنے والا کون ہے۔

شخص ہے جو ارادہ رکھتا ہے امر بالمعروف کا جس کو اس کا اہتمام ہے عزم ہے، جس کو واقعی یہ حالات واعذار پیش آویں گے۔ اس کو بے شک ہر حالت کے آداب واعذار معلوم کرنے چاہئیں کیونکہ اس کو یہ امور پیش آویں گے، یا مستفتی وہ ہے جس کا نہ کبھی ارادہ ہوا، امر بالمعروف کا اور نہ آئندہ ہوگا۔ بلکہ ظالم کا قصد یہ ہے کہ عمر بھر کبھی کسی کو کچھ نہ کہوں گا کیونکر دوسرے کی دل شکنی کروں۔ محض اپنے بچاؤ کے واسطے شرائط معلوم کرتا ہے تا کہ ان کو آڑ بنادے۔ اس لیے صرف مسقطات (۱) کی فہرست جاننا چاہتا ہے تا کہ ہر حالت میں جی کو سمجھالے۔ ایک تاویل کرے اور ہر حال کے لیے ایک من گھڑت (۲) عذر تراش لے۔

آدابِ دعوت

صاحبو! امر بالمعروف بھی ایک فرض ہے جیسے اور فرائض ہیں اور کوئی ایسی حالت نہیں جس میں فرائض ساقط ہوسکیں (۳)، بجز جنون واکراہ وغلبہ عقل اور خاص خاص اعذار کے باقی کسی حال میں فرائض ساقط نہیں ہوتے اور مغلوب العقل بھی وہی معتبر ہے جس کو شریعت مغلوب العقل تسلیم کرے، تمہاری من گھڑت تفسیر کا اعتبار نہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک قصبہ میں ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق مغلظہ دی تھی (۴)۔ عدت بھی گزر چکی تھی اس کے بعد ایک مفتی آئے۔ انہوں نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ طلاق واقعہ ہونے کے لیے عقل شرط ہے اور تم تو اس وقت مغلوب العقل تھے۔ بس اس تاویل سے حرام عورت حلال کر لی اور ان کے نزدیک حلال بھی ہوگئی تو اس طرح تو جس کا جی چاہے دعویٰ کردے مغلوب العقل ہونے (۵) کا، پھر تو سارا جہان مغلوب العقل ہوجائے گا۔ مثلاً امر بالمعروف کرنے میں اصل تو تعلقات شگفتہ نہ رہنے کا خوف تھا مگر تاویل کر لی کہ میں بغض فی اللہ کے سبب ہوش باختہ (۶) ہوگیا تھا۔ اس لیے امر بالمعروف نہ کرسکا یا طمع تھی کسی چیز کے ملنے کی مگر وہاں بھی وہی تاویلیں گھڑ لیں۔ صاحبو!

(۱) صرف ان باتوں کی فہرست جاننا چاہتا ہے جس سے امر بالمعروف کا حکم ساقط ہوجائے (۲) خود ساختہ (۳) فرائض کی ادائیگی کا حکم ختم ہوجائے (۴) تین طلاق صریح طور پر دیدیں (۵) عقل ٹھکانے نہیں تھی (۶) ہوش اڑ گئے تھے۔

اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان تاویلات کا جو تمہاری تراشی ہوئی ہیں کچھ اعتبار نہیں۔ تمہارے فتویٰ سے امر بالمعروف ساقط نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں کہ جو تمہارا دل چاہے وہی ہوجائے تمہاری رائے معتبر نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند(۱)

کسی صاحب کمال سے پوچھنا چاہیے۔ اگر وہ کہہ دے کہ تم معذور ہوتو ٹھیک ہے۔ ورنہ تمہارے خیالات کا یا جہلاء کے کہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ کسی صاحب بصیرت کی شہادت ہونی چاہیے۔ ورنہ اس طرح تو ہر شخص کوئی نہ کوئی عذر تراش لے گا۔ غرض پہلے ہر شخص قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ امر بالمعروف کا قصد ہے یا کہ قصد نہیں، محض اس سے رہائی اور مخلصی ہی چاہتا ہے۔ اگر قصد ہوتو وہ بے شک اس کے آداب واعذار وشرائط سیکھے۔ علماء سے پوچھ کر یا کتاب سے دیکھ کر اس لیے کہ امر بالمعروف کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے کہ جس طرح ہو اندھا دھند دعوت وتبلیغ کرو کہ نہ شرائط کی پروا، نہ آداب کی رعایت۔ بلکہ اس کے لیے ضوابط اور طریق مقرر ہیں کیونکہ امر بالمعروف فرضیت میں نماز سے تو بڑھ کر نہیں بلکہ برابر بھی نہیں۔ اور اسی لیے قرآن میں اقامتِ صلوٰۃ کے بعد امر بالمعروف کا حکم ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔(۲)

مگر پھر بھی نماز کے لیے کچھ آداب واعذار وضوابط ہیں۔ یہ نہیں کہ جو نماز پڑھنا چاہے اس کے لیے کوئی ضابطہ ہی نہیں، نہ وضو کی ضرورت، نہ ستر عورت کی(۳)، نہ قراءت کی، نہ پاکی کا خیال، نہ استقبال قبلہ کی ضرورت۔ یہ نہیں بلکہ اگر نماز پڑھنا ہے تو اول قرأت سیکھو، ناپاک ہوتو نہاؤ، قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر کھڑے ہو، یہ فرائض ہیں نماز کے کہ بغیر ان کے نماز ہوتی نہیں۔ تو جیسے نماز فرض ہے اور پھر بھی اس کے لیے شرائط وارکان وغیرہ ہیں۔ ایسے ہی امر بالمعروف کے لیے بھی کچھ قواعد وآداب ہیں۔ علماء سے ان آداب وضوابط کو پوچھنا چاہیے۔ علماء محققین اس کو بتلادیں گے کہ اس کے لیے کیا شرط ہے اور کیا ضابطہ ہے۔

(۱) ’’کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ، چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہوسکتا‘‘ (۲) ’’نماز قائم کرو اور نیک کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے منع کرو‘‘ سورۃ القمان: ۱۷ (۳) نہ ستر چھپانے کی۔

طرز دعوت

چنانچہ امر بالمعروف کی ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ ایک فروع کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس کے الگ آداب ہیں۔ علماء سب پہلوؤں کو جانتے ہیں۔ ان کا علم تم سے زیادہ محیط ہے[۱]۔ پس اس کا طریق ان سے سیکھو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ بس جیسے ہو کرلو۔ نہ کوئی ضابطہ نہ قاعدہ۔ جو ملا اس کو امر بالمعروف اندھا دھند کردیا۔ گویا ایک لٹھ سا مار دیا۔ مثلاً کوئی کافر ملا۔ اس سے کہا ابے! تو مسلمان ہوجا، اس نے جواب میں کہا ابے! تو کافر ہوجا۔ بس اب کیا تھا لٹھ چل پڑا۔ صاحبو! یہ کوئی معمولی کام نہیں بہت نازک کام ہے، اس کے واسطے بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ان میں اس کے آداب مذکور ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل فن ہے۔ اس کو سیکھ کر پھر عمل شروع کرو۔ محقق علماء سے کام کرنے کا طریقہ سیکھو، اپنی رائے سے کچھ نہ کرو۔ اپنی رائے کا شریعت میں کچھ اعتبار نہیں۔ بلکہ اہل علم کو بھی چاہیے کہ جو کام کریں اپنے سے زیادہ عالم سے پوچھ کر کریں۔ بلکہ ترقی کرکے کہتا ہوں کہ بڑوں کو بھی چاہیے کہ چھوٹوں سے مشورہ کرلیا کریں، (مشورہ کا لفظ میں نے ادب کے لیے استعمال کیا ہے) اگرچہ بڑوں کو اکثر چھوٹوں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر کبھی چھوٹے کو کوئی بات ایسی معلوم ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں ہوتی، گو غالب ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر تو بڑوں ہی کو زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی مشورہ کرلینا چاہیے۔ اگرچہ ان کا علم زیادہ نہیں لیکن ممکن ہے کہ ان کو کوئی خاص مصلحت معلوم ہو، کوئی واقعہ معلوم ہو، بلکہ بکثرت واقع ہے کہ واقعات چھوٹوں کو زیادہ معلوم ہوتے ہیں، بڑوں کو معلوم نہیں ہوتے اور واقعات کی لاعلمی سے ان کے کمال میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ دیکھئے ہدہد جیسا کوئی جانور چھوٹا نہیں اور سلیمان علیہ السلام جیسا کوئی بڑا آدمی نہیں۔ مگر پھر ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہتے ہیں: اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ (کہنے لگا کہ میں ایسی بات معلوم کرکے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں اور اجمالی بیان اس کا یہ ہے کہ میں آپ کے پاس قبیلہ سبا کے ایک ملک کی خبر لایا ہوں)۔

(۱) ان کا علم تم سے بہت زیادہ ہے۔

کہ میں سبا سے ایک خبر لایا ہوں جس کو آپ نہیں جانتے ہیں۔ اس پر سلیمان علیہ السلام نے نکیر نہیں کیا(۱) اور نہ اللہ تعالیٰ نے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو اہتمام کے ساتھ اس قصہ کو بیان فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ بڑوں کو کسی واقعہ سے لاعلمی ہونا یہ نقصان فی الکمال نہیں۔ کیونکہ واقعات امور غیر مقصود ہوتے ہیں۔ ہاں امور مقصودہ یعنی احکام کا علم بڑوں کو زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ چاہے چھوٹے کے پاس کچھ علم نہ ہو مگر مشورہ سے کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ اس سے مزید اطمینان ہوجاوے گا۔ صاحبو! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ لینے کے لیے مامور بہ ہیں۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۲) تو ہم کو تو ضرور مشورہ لینا چاہیے۔ یہ سنت نبوی ہے اور ہمارے اکابر کا بھی یہی طرز تھا۔ وجہ یہ کہ مشورہ کرنے سے خواہ وہ چھوٹوں ہی سے ہو۔ بعض دفعہ کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور جب بڑے کو چھوٹے سے مشورہ کرنے کا حکم ہے تو چھوٹے کو بطریق اولیٰ بڑوں سے پوچھنا چاہیے، پھر جس طرح اپنے اکابر اپنے مقتداء حکم دیں اس طرح کرلے۔ یہ طریقہ ہے کام کرنے کا۔ امر بالمعروف کے یہ معنی کہ بس جو کافر ملے، ہاتھ پکڑ کے اسے مسلمان بنانا شروع کردے، بعض دفعہ یہ طرز مضر ہوتا ہے (۳)۔ اس لیے اس کا ڈھنگ اور طرز سیکھنا چاہیے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگائی ہے۔ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (۴)۔ معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے۔ ورنہ مطلق فرماتے، بالحکمۃ نہ فرماتے۔ بہرحال اس کے شرائط ضرور ہیں۔ مگر وہ اسی کے لیے ہیں جو کام کرنے کا قصد کرے، اب تو دیکھا جاتا ہے کہ لوگ قصد ہی نہیں کرتے اور عوام تو عوام خواص کو بھی ادھر توجہ نہیں۔

دعوت اور منازعت

اور خواص میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو مشائخ نہیں، ان کی تو کیا شکایت، کیونکہ عوام ان کے زیادہ معتقد نہیں ہوتے۔ ان میں جو مشائخ ہیں وہ مقتدائے

(۱) سلیمان علیہ السلام نے اس کا انکار نہیں کیا (۲) اور (اہم) امر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مشورہ کریں (۳) نقصان دہ (۴) اپنے پروردگار کے راستے کی طرف) یعنی حکمت سے بلائیے۔

وقت مانے جاتے ہیں جن کے بہت لوگ معتقد ہیں۔ سب سے زیادہ کوتاہی انہی میں ہے وہ بس اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھ جاویں۔ جنت میں پہنچ جاویں گے۔ ان کو کسی کی اصلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ اس کو تو شانِ مشیخت سے اس قدر بعید سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شیخ اس کام کو شروع کرے تو اس کو مشیخت کے دفتر سے خارج کر کے محض علماء کے دفتر میں داخل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک دفعہ الٰہ آباد گیا تھا۔ والد صاحب کی بیمار پرسی کے لیے، وہاں ایک درویش تھے، والد صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے۔ جب درویش نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ۔ میں نے ترجمہ کر دیا۔ تو کہنے لگے دیکھو! حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے، پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں۔

موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود (۱)

جو جس کے جی میں آوے کرے۔ ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی۔ یہ تفسیر کی انہوں نے۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی تفسیر حاضر نہیں تھی۔ میں نے لفظوں ہی سے ان کو جواب دیا۔ میں نے کہا حق تعالیٰ نے لا ینازعنك فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لا تنازعهم نہیں فرمایا کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں۔ بلکہ آپ کے لیے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں: وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ۔ (۲)

یعنی دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو باطل پرست تھے، حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراطِ مستقیم پر تھے۔

تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیت کا یہ ہے کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں، آپ کو تو حق ہے۔ منازعت صوری یعنی دعوت کا۔ مگر ان کو حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں۔ میں نے کہا

(۱) ''موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا اپنا دین اختیار کرے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا اپنا دین اختیار کرے''

(۲) ''اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کی طرف بلائیے بے شک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) صراط مستقیم پر ہیں'' سورۃ الحج: ٦٧۔

اس جگہ حضور کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں۔ بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا سا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گزریں۔ لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں۔

اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لا ینازعنك کا مطلب لا تنازعهم لکھ دیا ہے کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں۔ یقینا شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ تھی۔ ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا کہ منازعت اور ہے، دعوت اور ہے۔ اگر منازعت حقیقیہ سے ممانعت ہے۔ دعوت سے تو ممانعت نہیں۔ پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کر دیا کرو۔

صلح کل

مگر غضب تو یہ ہے کہ آج کل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے۔ بلکہ سب کے ساتھ صلح کل ہو کر رہے۔ وہ تو دریشی ہے ورنہ نہیں اور اس کے لیے ایک شعر گھڑا ہے اور اس کو حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے اول میں حافظا آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملا لیا جائے کہ جس شعر میں حافظ آ جائے بس وہ حافظ شیرازی ہی کا ہے۔ مگر یہ محض مہمل دلیل ہے۔ کیا کوئی دوسرا شخص اپنا تخلص حافظ نہیں کر سکتا۔ یا اپنا شعر رائج کرنے کو جعلی طور پر حافظ کا لفظ اپنے شعر میں نہیں بڑھا سکتا۔

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ یہ شعر اول تو حافظ کا ہے نہیں اور اگر ہوتا بھی، تو چونکہ ہم کو ان سے حسن ظن ہے۔ ہم اس کی تاویل کرتے۔ ہاں جو خشک دماغ ہے وہ تو تاویل نہیں کرے گا بلکہ حافظ پر طعن کرنے لگے گا۔ مگر ہم ایسے بے ادب نہیں۔ پس یہی قاعدہ غلط ہے کہ جس شعر میں لفظ حافظ ہو اس کو حافظ شیرازی کی طرف منسوب کیا جائے۔ اسی طرح جو کلام مثنوی کے وزن پر ہو تو اس کو مولانا روم کی طرف منسوب

کردیتے ہیں۔

اب سنئے کہ انہوں نے کون سا شعر گھڑا ہے اور اس کو حافظ کی طرف منسوب کیا۔ حالانکہ وہ حافظ شیرازی کا شعر کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

وہ شعر یہ ہے:

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص وعام　　　بامسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام!(۱)

بھلا جس کو ذرا بھی حافظ کی بلاغت وفصاحت کا ذوق ہے وہ تسلیم کرسکتا ہے کہ یہ ان کا کلام ہے۔ ہرگز نہیں۔ دوسرے حافظ شیرازی رام رام جانتے بھی نہ تھے۔ انہوں نے تو عمر بھر کبھی سنا بھی نہ ہوگا اور بڑی بات یہ ہے کہ حافظ کا دیوان موجود ہے اس میں دیکھ لو اور تماشا یہ کیا کہ باوجود یہ کہ دیوان کے اندر تحریفیں بہت ہوئی ہیں مگر یہ شعر تحریف کے بعد بھی اس میں موجود نہیں۔ پس یہ شعر دیوان حافظ کا تو ہے نہیں۔ ہاں کسی دیوانہ حافظ کا ہوگا۔(۲)

عرفی تصوف

ایک اور شعر بھی ہے جس سے آج کل کے صوفی اپنے مسلک صلح کل پر استدلال کرتے ہیں اور وہ واقعی حافظ کا ہے:

مباش درپے آزار وہرچہ خواہی کن　　　کہ در شریعت ما غیر ازیں گنا ہے نیست(۳)

اس کو بھی صوفیوں نے اپنا مستدل ٹھہرایا ہے کہ بس کسی کو آزار نہ دینا چاہیے۔ دل دکھانا اچھا نہیں۔ پھر کیوں کسی کو امر بالمعروف کیا جائے۔ میں کہتا ہوں کیا ایک متکبر کا دل دکھانا بھی منع ہے۔ اگر اس شعر میں ہر آزار کی ممانعت ہے۔ تو پھر ہرچہ خواہی کن کی بھی عام اجازت ہونی چاہیے۔ پھر کیا ہے، بس زنا کی بھی اجازت ہونی چاہیے، چوری کی بھی اور غصب، لوٹ مار اور ڈاکہ کی بھی پس جو چاہو کرو۔ سب کی اجازت ہے۔

اگر کہو کہ چوری سے تو آزار ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آزار کی ممانعت میں داخل ہے۔

(۱) ''اے حافظ اگر وصل چاہتے ہو تو ہر خاص وعام سے صلح رکھو، مسلمان کے ساتھ اللہ اللہ اور برہمن کے ساتھ رام رام''(۲) کسی باولے حافظ کا ہوسکتا ہے(۳) ''کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ اور جو جی چاہے کرو، کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا اور کوئی گناہ نہیں ہے''۔

میں کہتا ہوں کہ زنا میں تو آزار نہیں۔ شاید کہو کہ شوہر اور خاندان کو آزار ہے۔ تو اگر کسی کو کوئی عورت ایسی مل جاوے کہ نہ اس کا خاوند ہے، نہ اس کا باپ ہے، نہ بھائی، کوئی نہیں ہے اور وہ خوشی سے یہ فعل کراتی ہے، تو یہاں کسی کو آزار نہیں ہے۔ نہ اس کو نہ اور کسی کو۔ تو کیا اس کو اجازت ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں۔ تو پھر اس میں تخصیص کرو گے اور تخصیص کسی دلیل سے کرو گے یا بے دلیل۔ جیسے بھی ہو اگر تم ''ہر چہ خواہی کن'' میں تخصیص کرتے ہو تو ہم یہاں (یعنی آزار میں) بھی تخصیص کریں گے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار نہ دو اور درحقیقت درپے آزار ہونا یہی ہے اور جو شخص آزار بغرض اصلاح دے۔ جیسے طبیب اور ڈاکٹر آپریشن کرتا ہے۔ یا باپ، استاد، بچہ کو تادیباً مارتا ہے۔ اس کو ہرگز درپے آزار شدن نہیں کہہ سکتے۔(۱) پھر امر بالمعروف کرنے والے سے اگر کسی کو آزار پہنچے بھی تو اس کو درپے آزار کہنا صحیح نہیں۔ لہٰذا وہ اس شعر کا مصداق ہی نہیں۔ پس امر بالمعروف سے رکنے کے واسطے اس شعر کو آڑ بنانا محض باطل ہے۔ دوسرے یہ کہ مباش درپے آزار میں اگر آزار ایسا ہی عام ہے تو پھر اس میں مخاطب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ صرف مخاطب ہی کو آزار نہ پہنچایا جاوے۔ غائب کو آزار پہنچ جاوے۔ سبحان اللہ! بلکہ اس کو بھی عام کہو۔ کہ صاحب آزار کوئی ہو، آزار میں تعمیم کر کے صاحب آزار میں کیوں تخصیص کی جاتی ہے۔ بلکہ جیسے آزار میں تعمیم کرتے ہو، صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو۔ اگر صاحب آزار میں بھی تعمیم کرو گے۔ تو پھر کوئی بھی معصیت ایسی نہ ہوگی۔ جس سے کسی نہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ایسا کوئی امر نہ نکلے گا۔ جو کسی نہ کسی کے لیے سبب آزار نہ ہو۔

مرزا بیدل کی اصلاح

شاید آپ سوچتے ہوں گے کہ ہمارے گناہوں سے کس کو آزار پہنچتا ہے تو آپ ایک حکایت سے اس کا اندازہ کر لیجئے۔ مرزا بے دل شاعر کی شکایت کی حکایت ہے کہ ان کے اشعار تصوف کا رنگ لئے ہوئے ہوتے تھے۔ کسی ایرانی نے ان کے اشعار کو دیکھ کر پسند کیا اور ان کو بزرگ سمجھ کر ان کے پاس آیا جب ان کے پاس پہنچا تو

(۱) کسی کو تکلیف دینے کے درپے ہونا نہیں کہتے۔

یہ حجام سے داڑھی منڈار ہے تھے۔ اس کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا اور جھلا کر اس نے پوچھا۔
آغا ریش می تراشی (آغا صاحب ڈاڑھی منڈار ہے ہو)
شاعر نے جواب دیا:

آرے ریش می تراشم ولے دلے کسی نمی خراشم (۱)

وہ بے چارہ مخلص تھا۔ اس نے آزادانہ جواب دیا۔

آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی (۲)

مخلص تو درپے مصلحت کے نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی مصلحت تو یہ ہے:
مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند وخم طرہ یارے گیرند!(۳)

شاعر نے تصوف مزعوم (۴) کے اعتبار سے اور اسی عرفی تصوف کے طور پر جواب دیا تھا۔ کہ دل کسے نمی خراشم۔

ایرانی نے جواب دیا کہ ظالم تُو تو سب سے بڑے دل کو چھیل رہا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ''دل کسی نمی خراشم بلے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی'' تم یہ داڑھی پر استرہ نہیں پھرا رہے ہو بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر چھری چلا رہے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اعمال پیش ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا ہے کہ میری امت کا ایک شخص یہ حرکت کرتا ہے۔ کیا اس سے آپ کا دل نہیں دکھتا اور کیا آپ کا دل دکھانا چھوٹی بات ہے۔ آپ کا قلب تو سید القلوب ہے (۵) جب تم سید القلوب کو تکلیف دیتے ہو۔ پھر یہ دعوے کیسے کرتے ہو کہ ہم کسی کا دل نہیں دکھاتے ہیں۔ ارے تم درپے آزار تو ہوگئے۔ یہ سن کر مرزا کی آنکھ کھلی اور چیخ ما کر بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو توبہ کی اور بزبان حال یا قال یہ کہتا تھا۔
جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی　　مرا با جان جاں ہمراز کردی (۶)

(۱) ''جی ہاں ڈاڑھی منڈار ہا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھا رہا'' (۲) ''جی ہاں تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا رہے ہو'' (۳) ''میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست، سب کام کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے'' (۴) اپنے گمان کے مطابق تصوف کی تعریف سمجھتے ہوئے یہ جواب دیا تھا (۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تو سب دلوں کا سردار ہے (۶) ''اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب حقیقی سے ہمراز کر دیا''۔

یعنی میں تو اندھا تھا، میری کبھی ادھر نظر ہی نہیں گئی کہ مجھ سے اتنے بڑے قلب کو ایذا ہو رہی ہے۔ یہاں تک میرے ذہن کی رسائی ہی نہیں ہوئی۔ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ خدا تجھ کو اس کی جزا دے۔

اب اس حکایت سے سمجھ لیجئے کہ جب آپ سے کوئی امر غیر مشروع سرزد ہوگا(۱)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے آزار ہوگا یا نہیں؟ اس لیے ترک احکام شرعیہ کے لیے اس کو آڑ بنانا اور یہ کہنا کہ:

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کُن (۲)

بالکل واہیات ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ سنار کی کھٹ کھٹ، لوہار کی ایک۔ ہم تمہیں ہر ہر بات کا کہاں تک جواب دیں، تم نے ایک بات نکالی، ہم نے اس کا جواب دیا، دوسری نکالی اس کا دیا۔ آخر یہ سلسلہ کہاں تک رہے گا، سیدھا جواب یہ ہے کہ نصوص کے مقابلہ میں سب اشعار ہیچ ہیں (۳)۔ پس ہم تو جانتے ہیں کہ یہ خدا رسول کا حکم ہے۔ اس کے سامنے کہاں کی مصلحت کہاں کی حکمت۔ نصوص کے اندر امر بالمعروف کا حکم موجود ہے اور نہ کرنے پر نکیر ہے (۴)۔ ہم تو یہ جانتے ہیں بس اس کو کرو۔ البتہ شرائط واحکام کے ساتھ کرو۔ اندھا دھند لسٹم پسٹم مت کرو۔ فقہاء نے اس کی ایک مستقل بحث لکھ دی ہے۔ اس کے قوانین وضوابط کو مدون کر دیا ہے۔ اس کو سیکھو، علماء سے پوچھو۔ وہ تم کو راستہ بتاویں گے۔ اور اس قسم کے اشعار سے نصوص کا مقابلہ نہ کرو۔

حاکمانہ جواب

اور جو کوئی جاہل نصوص کا مقابلہ ان اشعار سے کرے اس کو ڈانٹ دینا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنین کی دیت میں غرہ عبد یا امۃ کا حکم دیا تھا۔ مدعا علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کے سامنے یہ کہا:

کیف اعزم من لا شرب ولا اکل ولا نطق ولا استھل ومثل ذٰلک بطل **یعنی ایسے**

---

(۱) جب آپ کوئی ایسا کام جس کا شریعت نے حکم نہیں دیا کریں گے (۲) ’’کسی کو تکلیف نہ دو اور جو جی چاہے کرو‘‘ (۳) قرآن وحدیث کے مقابلے میں اشعار کی کوئی حیثیت نہیں ہے (۴) قرآن وحدیث میں اچھائی کا حکم کرنے کو کہا گیا ہے اور نہ کرنے کی برائی کی گئی ہے۔

بچہ کی کیا دیت جس نے نہ کھایا نہ پیا اور نہ بولا نہ چلایا اور ایسا معاملہ تو یونہی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسجع کسجع الکھان (۱)

کیا واہیات ہے کاہنوں جیسی مسجع مقفی عبارت سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہو۔ غرض حضور نے اس کو ڈانٹ دیا۔ تو بعض جگہ اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہیں حاکمانہ جواب مناسب ہوتا ہے اور کہیں حکیمانہ۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔ عوام اسی سے بگڑ گئے۔ علماء کے حکیمانہ جواب ہی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ حتی کہ اب ہر بات کی علل واسرار (۲) پوچھنے کی جرأت ہوگئی۔ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ حائض سے نماز تو ساقط ہوگئی اور روزہ کی قضاء لازم۔ جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو اتنے جوتے سر پر پڑیں گے، سر پر بال بھی نہ رہیں گے۔ اس جواب کی یہ وجہ نہ تھی کہ مولانا کو حکمت معلوم نہ تھی۔ بلکہ اس کے لیے یہی جواب مناسب تھا کیوں کہ ما بہ الفرق (۳) سمجھنے کی لیاقت اس میں نہیں تھی۔ چنانچہ اسی سوال کو دوسرے ایک فہیم (۴) نے دوسری ایک مجلس میں پوچھا۔ تو آپ نے اس کو مفصلاً بیان کر دیا، تو ہر مخاطب کا مذاق جدا ہے، ہر ایک کی حالت جدا ہے۔ اس کے رتبے کے موافق جواب دینا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جوابات

میرے پاس ایک سب انسپکٹر کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ وہ اس کی علت دریافت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے۔ پھر انہوں نے لکھا کہ علماء کو ایسا خشک نہ ہونا چاہیے۔ میں نے دل میں جواب دیا کہ جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیے کہ ڈوب ہی جاویں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ سے ملے اور اپنا پورا پتہ بتلایا کہ میں وہی ہوں جس کا ایسا ایسا خط گیا تھا اور تم نے یہ جواب دیا تھا۔ جب سارا قصہ بیان کیا تو میں نے پہچان لیا اور کہا ما شاء اللہ آپ سے تو

(۱) الصحیح لسملم، قسامۃ: ۳۷، سنن النسائی ۸:۵۲، بلفظ: "اسجع کسجع الأعراب"
(۲) ہر حکم کی علت وحکمت پوچھنے لگے (۳) دونوں حکموں میں فرق سمجھنے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی
(۴) سمجھدار شخص۔

بڑا پرانا یارانہ ہے۔ پھر مجھ سے انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ خشک جواب کیوں دیا تھا۔ میں نے کہا کہ انصاف سے بتلائیے۔ آپ سب انسپکٹر ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کے تعلقات ومعاملات سب کے ساتھ یکساں ہیں، یا کسی سے خصوصیت ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ کیا آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں یا مخصوص کے ساتھ خصوصیت کے برتاؤ سے پیش آتے ہیں اور غیر مخصوصین کے ساتھ ضابطہ کے برتاؤ سے۔ کہا سب سے یکساں برتاؤ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرق ضرور ہے۔ میں نے کہا، ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے، جن سے خصوصیت ہے ان سے خصوصیت کا برتاؤ ہے اور جن سے نہیں ہے ان سے ضابطہ کا، مگر اب سے ایسا برتاؤ آپ کے ساتھ نہیں کیا جاوے گا، کیونکہ اب تعارف ہوگیا ہے، پھر میں نے یہ خیال کیا کہ ذرا ان کو بھی تو باندھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ دل کھول کر ہر بات کے حکم اور علل پوچھنے لگیں۔ تو میں نے کہا اس ملاقات کا جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ میں آئندہ ایسا برتاؤ نہیں کروں گا۔ ایسا ہی اس کا آپ پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی آئندہ ایسی اینڈی بینڈی (۱) باتیں نہ پوچھیں گے۔

ایسا ہی ایک اور شخص کا خط میرے پاس آیا، کہ فلاں حکم میں کیا حکمت ہے۔ میں نے لکھا کہ سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے۔ خدا کے حکم کی حکمت تو ممکن ہے بندہ کو معلوم نہ ہو۔ مگر سوال تو تمہارا فعل ہے، تم کو اپنے فعل کی حکمت ضرور ہی معلوم ہے۔ مہربانی کرکے ذرا بتلاؤ تو سہی۔ میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اگر وہ سوال عن الحکمت کی کچھ حکمت بتلادیں گے تو میں اس کو باطل کردوں گا۔ غرض کبھی اس قسم کے بھی جواب دینا چاہئیں۔ علماء نے عوام کا حوصلہ بڑھا دیا ہے نرم جواب دے کر۔

ایک اور شخص نے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے کہا، اس کا جواب تمہاری سمجھ میں نہیں آوے گا، تو کہتے ہیں کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ کہیے۔ میں نے کہا، میرا دماغ مفت کا نہیں، مگر وہ بڑا ہی ہٹی (۲) تھا، کسی طرح ٹلا ہی نہیں جب بہت ہی تنگ کیا تو میں نے کہا کہ ایک طالب علم کو بلالو میں اس کے سامنے تقریر کردوں گا۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم علماء کے متعلق جو آپ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ ایسے

(۱) الٹی سیدھی (۲) ضدی۔

سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس کا غلط ہونا معلوم ہوجاوے گا۔ گو ہم کسی مصلحت سے جواب نہ دیں اور میں نے یہ شعر پڑھا:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست (۱)

یعنی یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر نا اہل ناجنس پر ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تم دیکھ لوگے کہ تم اس تقریر کو نہیں سمجھ سکتے اور جب نہیں سمجھ سکتے تو تم سے خطاب کرنا موت ہے۔ میری زبان ہی نہیں چلے گی۔ کیونکہ

فہم سخن تا نہ کند مستمع قوت طبع از متکلم مجو (۲)

اگر جہلاء کو اس طرح حاکمانہ جواب دیا جاوے تو ان کی جرأت نہ بڑھے گی۔

حضرت تھانوی کا مسکت جواب

میں ایک دفعہ سہارنپور گیا تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسن اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا، مگر وہی مرغے کی ایک ہی ٹانگ (۱) ان کی سمجھ میں کہاں آنا تھا۔ کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آگیا، ان سے پوچھنا چاہیے، چنانچہ میرے پاس بھی آئے، پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم، اسلام ہی سے خشونت اور اکھڑپن ٹپکتا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی۔ ذرا اس کو دیکھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے۔ آپ کہیے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا، میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے مطلب تو ظاہر ہے، اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے۔ کہا جی علت نہیں سمجھا۔ کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا، آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں۔ کہا جی ہاں بہت سے۔ میں نے کہا کہ کیا ان سب کی علت کو آپ نے معلوم کرلیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہوچکی تو مجھے اجازت دیجئے کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کرلوں۔ کہا ہاں! غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں۔ میں نے کہا،

(۱) ''راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ ہو'' (۲) ''جب تک سننے والا کلام کا سمجھنے والا نہیں ہوتا بولنے والے کی قوت گویائی کو تلاش مت کر''۔

پھر اسے بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے۔ مگر بولے کچھ نہیں۔ پس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا۔ میں نے کہا، حضرت میں آپ کی طرح خلیق نہیں کہ ایک کوڑھ مغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز ماروں۔ اخیر میں بز اخفش کی طرح وہ کہے کہ میں نہیں سمجھا اور پھر میں تقریر کروں۔ قصہ بز اخفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا ہے۔ یہ پھر تقریر شروع کرتے۔ ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے (۱) تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا۔

جواب کے مختلف انداز

اس کے بعد اور ایک جنٹلمین صاحب آئے۔ وہ بھی اسی علت میں مبتلاء تھے۔ مہذب عنوان سے کہنے لگے کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ بہت رنج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں جہلاء اعتراض کرتے ہیں جو ناگوار ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کروں۔ آپ اس میں ان چند مسائل کی تقریر کر دیں۔ میں نے کہا، میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں۔ مگر عقلی قاعدہ ہے کہ الاہم فالاہم جو کام سب سے اہم ہو۔ پہلے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ آپ کو مسلم ہے (۲) یا نہیں۔ کہا ضرور مسلم ہے۔ کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا۔ اس کو بغیر تسلیم کئے تو چارہ ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے عقلیات سارے مسلم ہیں، بس نقلیات ہی میں کلام ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک طبقہ وہ ہے جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ ان سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرتا ہے (۳)۔ تو ترتیب سے کام کرنا چاہیے۔ آپ اول ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) اسی طرح دو دو تین تین دفع تقریر کرتے (۲) آپ اسی اصول کو مانتے ہیں (۳) برا بھلا کہتا ہے۔

کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں، پھر ان کی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہیں چھوڑتے۔ پھر ان کی جو آئمہ کو برا بھلا کہتے ہیں جب ان سب کا انتظام ہو جاویگا۔ آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے والی رہے گی۔ اس کا انتظام میں کردوں گا، اب وہ چپ! کیا جواب دیں، جب دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اس وقت ان کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر کردی جائے تو ضرر ہی کیا ہے۔ میں نے کہا کچھ ضرر نہیں، کہنے لگے پھر ایسا کر دیجئے۔ میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم ہے۔ اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں، میں آپ کا کوئی محکوم نہیں۔ نوکر نہیں، آپ کا شاگرد نہیں، مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے تو مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا۔ آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو چکے۔ آگے ہمارا کام ہے۔ ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے۔ آپ کی کچہری کا وقت آ گیا ہے۔ تشریف لے جایئے۔ غرض یہ بھی چلے گئے، تمام دن یہی قصہ رہا۔ مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا۔ کسی کو دو منٹ میں اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا۔ غرض یہ کہ ہر سائل کے ساتھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق بنے۔ اصلاح اسی طرح ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ اول تو حقیقت ظاہر کرو اور اگر نہ سمجھے تو آخر میں کہہ دو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے۔ خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں۔

مولانا یعقوب صاحب کی حکایت

اسی کے مناسب ایک اور حکایت ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب ایک بار ایک دعوت کے جلسہ میں رڑکی تشریف رکھتے تھے۔ اس جلسہ میں ایک غالی صوفی صاحب سماج جواز سماع(۱) کے دلائل بیان کر رہے تھے۔ مولانا کی وضع سادی تھی۔ اس لیے وضع سے کسی نے یہ نہیں پہچانا کہ یہ کوئی عالم یا بزرگ ہیں۔ اس صوفی نے دلیل جواز سماع میں مولانا رومی رحمۃ اللہ کا یہ شعر پیش کیا:

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند(۲)

(۱) قوالی سننے کے جائز ہونے پر دلائل بیان کر رہے تھے (۲) ''بانسری سے سن ایک حکایت بیان کرتی ہے اور جدائیوں کی شکایت کرتی ہے''۔

اور کہا کہ اس میں بشنو امر ہے اور امر وجوب کے لیے ہے۔ اس کا حقیقی جواب تو یہ تھا کہ بے شک امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے مگر کس کے امر سے۔ مولانا کے امر سے یا اللہ تعالیٰ کے امر سے، مگر یہ جہلاء لوگ تو اس کو کچھ نہیں سمجھتے بس ان کو تو اڑتی ہوئی ایک بات ہاتھ لگ گئی کہ امر وجوب کے لیے ہے۔ وہ جہلاء ان باتوں کو کیا جانیں کہ امر کے اقسام کتنے ہیں۔ اس لیے مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ مولانا رومی کا قول جب حجت ہو کہ پہلے خود ان کا حجت ہونا ثابت کیا جاوے۔ سو سب سے پہلے تو تم ان کا مسلمان ہونا ثابت کرو۔ بس اس جواب سے ان پر تو مٹی پڑ گئی اور سارے دلائل گاؤ خورد ہو گئے (۱)۔ غرض ہر جگہ جواب کا مختلف طریقہ ہے۔ کہیں نرمی کا جواب اچھا ہے۔ کہیں سختی کا اور کہیں جوتے کا جواب بہتر ہوتا ہے۔ مولانا ہی کا شعر ہے:

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القُمَمِ (۲)

اور فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں چار کتابیں نازل فرمائی ہیں وہاں ایک پانچویں کتاب حدید بھی اتاری ہے۔ چنانچہ ارسال رسل وانزال کتب کے بعد ارشاد ہے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ۔ (۳) فرمایا کہ اس میں حدید سے مراد نعل دار جوتا ہے (۴) کہ اس سے دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے۔ کہ یَعِظُ السِّنَانُ اَکْثَرَ مِمَّا یَعِظُ الْقُرْاٰنُ۔ یعنی بعض قرآن کی نصیحت اتنا نہیں روکتی۔ جتنا ایک نیزہ کی نوک روک دیتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول دلائل بیان کرو۔ اگر ان دلائل کو نہ مانے تو صاف جواب دو کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ احکام الٰہی کے سامنے کوئی چیز حجت نہیں۔ اس لیے یہ اشعار بھی کچھ حجت نہیں۔ غرض امر بالمعروف یقیناً واجب ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ اس طرف توجہ بالکل نہیں اور یہ ایک بڑی کوتاہی ہے۔ اسی کوتاہی کو رفع کرنے کے لیے یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ نماز اور روزہ کی طرح یہ بھی فرض ہے۔

---

(۱) ختم ہو گئے (۲) ''وعظ نفع دیتا ہے اگر علم وحکمت سے معمور ہو لیکن تلوار سروں پر نصیحت گروں سے زیادہ بلیغ نصیحت ہے'' (۳) ''اور ہم نے لوہا نازل کیا اس میں بڑا خوف ہے'' (۴) ایسا جوتا جس میں کیل جڑے ہوئے ہوں۔

تدریس میں نیت تبلیغ

البتہ مختلف اوقات میں اس کے طرق مختلف ہیں۔ مثلاً اس وقت آپ لوگوں کا پڑھنا بھی تبلیغ ہے، اگر نیت اچھی ہے۔

انما الاعمال بالنیات۔(۱)

اگر آپ کی نیت میں یہ ہو کہ پڑھنے سے فارغ ہوکر امر بالمعروف کروں گا(۲) تو یہ پڑھنا بھی شعبہ تبلیغ ہی کا ہے۔ اگر یہ نیت نہ ہو تو پھر تبلیغ نہیں۔ دیکھو اگر کوئی شخص نماز کی نیت نہ کرے تو نماز نہیں ہوتی۔ ایسے ہی روزہ ہے، اگر نیت نہ کرے اور دن بھر فاقہ کرے تو روزہ نہیں ہوتا۔ غضب کی بات ہے کہ ہم رات دن پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر اعمال وطاعات کی نیت نہ کرنے کی وجہ سے ثواب سے محروم ہیں۔

غرض اچھی نیت سے اس وقت یہی کتابیں پڑھنا بے شک اصل تبلیغ ہے اور میں نے اس وقت کی قید اس لیے لگائی کہ پہلے زمانہ میں صحابہ وتابعین کو تدریس متعارف کی(۳) کوئی حاجت نہیں تھی۔ ان کا تو بغیر اس کے کام چلتا تھا۔ کیونکہ حافظے اور اذہان کافی تھے اور تدین بھی تھا اور اس وقت اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ اگر کتابیں مدون نہ ہوں اور آج کل لوگوں کا نہ حافظہ ویسا ہے، نہ ویسا تدین ہے، نہ اِن کے قول پر اُن جیسا وثوق ہے پھر زبانی کوئی مضمون حدیث وفقہ کا بیان کیا جاتا تو سامعین کو ہرگز تسلی نہ ہوتی اور خیال ہوتا کہ نہیں معلوم یہ جو کچھ کہتے ہیں، ٹھیک بھی ہے یا یوں ہی الٹ پلٹ ہانک رہے ہیں۔

ضرورت مدارس

اگر کتابیں مدون نہ ہوتیں تو بڑا خلط مبحث ہوتا، دین میں بڑا فساد پھیلتا۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اپنی عنایت ورحمت سے اس نے کتابیں مدون کرادیں، مدرسے قائم کرادیئے۔ اس کے سامان مہیا کردیئے۔ منجملہ ان سامانوں کے ایک یہ ہے کہ مدرسہ کے لیے چندہ بھی کیا جاوے۔ مگر شرط یہ ہے کہ طیب خاطر سے ہو اور جب ان چیزوں

(۱) ''بے شک اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے'' الصحیح للبخاری:۱/ ۸،۲/ ۱۷۵(۲) اچھائی کا حکم کروں گا (۳) تدریس مروجہ طریق کی۔

کی ضرورت ثابت ہوگی کہ بغیر ان کے کام نہیں چلتا۔ چنانچہ اگر کتابیں نہ ہوں تو سلف کی باتیں ہم تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اور بغیر مدارس قائم کئے تعلیم کتب ممکن نہیں لہٰذا یہ بدعت ہی نہیں ہے بلکہ سنت ہے کیونکہ اس درس وتدریس سے بھی مقصود تبلیغ ہی ہے خواہ بلا واسطہ یا بالواسطہ، چنانچہ تو تبلیغ مخاطب اول کو ہے، یعنی طلبہ کو اور بالواسطہ مخاطب ثانی کو یعنی عوام کو۔ سو یہ درس وتدریس تبلیغ کا اتنا بڑا فرد ہے مگر ہم نیت تبلیغ نہ کرنے سے اس کے ثواب سے محروم ہیں۔ انما الاعمال بالنیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت نہ کرنے سے اعمال کا ثواب نہیں ملتا۔ گو عمل متحقق ہوجاوے اور بعض اعمال تو بلا نیت متحقق ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ بعض اعمال تو ایسے ہیں کہ ان کا تحقق بھی بلا نیت نہیں ہوتا اور بعض ایسے ہیں۔ کہ ان کا تحقق تو ہوجاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا۔ جیسے پڑھنا اور پڑھانا کہ اسکا تحقق بلا نیت بھی ہوجاتا ہے مگر ثواب نہیں ملتا۔ بخلاف نماز روزہ کے کہ ان کا تحقق ہی بلا نیت نہیں ہوتا۔ چاہے یوں جہل سے کہہ لے کہ ہمارے یہاں تحقق نماز بدوں نیت بھی ہوجاتا ہے۔

جیسے کسی نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے دو میاں بی بی کے نکاح کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ ان کا یہ رشتہ ہے ان میں نکاح ہوجاوے گا یا نہیں۔ مولانا نے فرمایا، نہیں ہوسکتا تو وہ کیا کہتا ہے۔ کہ ہم نے تو کیا تھا ہوگیا تھا۔ اور جیسے ایک گنوار بے وضو نماز پڑھا کرتا تھا۔ کسی واعظ سے سنا کہ بلا وضو نماز نہیں ہوتی تو وہ کہتا ہے کہ بارہا کردیم وشد(۱)۔ اسی طرح اس گنوار نے سمجھا کہ بس ایجاب وقبول ہوگیا تو نکاح ہوگیا۔ حالانکہ رفع موانع شرائط تحقق (۲) سے ہے۔

درس وتدریس میں تبلیغ کی نیت

مگر بعض اعمال بغیر نیت کے بھی ہوجاتے ہیں مگر اجر نہیں ہوتا۔ جیسے تعلیم وتعلم، سو ہم لوگوں کا کتنا بڑا حرمان ہے کہ چوبیس گھنٹہ ہم اس میں مشغول، مگر نیت نہ ہونے سے ثواب سے محروم۔

رہا یہ شبہ کہ اگر نیت بھی دین کی اور تبلیغ کی ہوتی۔ تب بھی ثواب نہ ملتا کیونکہ

(۱) ہم نے بہت مرتبہ بڑھی اور ہو بھی گئی (۲) نکاح اس وقت ہوگا جب کوئی اس کا مانع موجود نہ ہو۔

اس کے ساتھ تنخواہ کی بھی تو نیت ہے اور یہ دنیا ہے۔تو نیت تبلیغ کے بعد بھی ثواب کہاں ہوتا۔ کیونکہ خالص تبلیغ ہی کی تو نیت نہیں۔ بلکہ مدرسین کو تو تنخواہ بھی مطلوب ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے۔ ایک تو وہ تنخواہ لینے والا ہے جس کو مقصود اصلی صرف نوکری اور تنخواہ سے ہے۔ ایک اور وہ جو تنخواہ نفقہ کے طور پر لیتا ہے جیسے قاضی بیت المال سے تنخواہ لیتا ہے اور اصل مقصود اس کا خدمت دین ہے ان دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جس کو مقصود بالذات دنیا تھی اس کو ثواب نہیں ملے گا۔ اور جس کو مقصود بالذات دین ہے مگر روپیہ گزراوقات کے لیے لیتا ہے اس کو ثواب ملے گا۔ اگر یہ شبہ ہو کہ جب دین کے ساتھ دنیا کا بھی خیال ہے تو مجموعہ تو دنیا ہی ہوا۔ کیونکہ مرکب دین و دنیا سے دنیا ہے کیونکہ نتیجہ تابع اخس (۱) کے ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جس کو تنخواہ مدنظر نہیں صرف گزراوقات کے لیے لیتا ہے اس کا مقصود تنخواہ کو کہا ہی نہ جاوے گا۔ خواہ بلاشرط ہو یا بالشرط۔ ورنہ قاضی، مفتی، بلکہ خلفاء راشدین کسی کو بھی ثواب نہ ملتا۔

اخلاص نیت کا امتحان

اب اس کی علامت کیا ہے کہ اس شخص کو مقصود صرف دین ہے اور تنخواہ صرف رفع حاجت کے لیے۔ سو اس کی علامت یہ ہے کہ جس کو تنخواہ ملتی ہے اس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے وہ اس کے نان ونفقہ کو کافی نہیں۔ اس حالت میں تو دوسری کوئی بڑی نوکری تلاش کرنا اس کے لیے یہ علامت قصد دنیا کی نہیں۔ لیکن اگر وہ رفع حوائج کے لیے کافی ہے۔ معاش میں کوئی تنگی نہیں ہے اور پھر بھی اس کو بڑی ملازمت کی تلاش ہے کہ اگر دوسری جگہ زیادہ تنخواہ ملے تو فوراً چلا جائے اور اس وقت محض ترقی ہی کی وجہ سے جاتا ہے۔ یہ تو علامت اس کی ہے کہ اس کو دین مقصود نہیں، دنیا مقصود ہے اور دوسری حالت یہ ہے کفایت کی ضرورت میں دوسری جگہ کی تلاش نہ ہو اور ملے بھی تو نہ جائے۔ یہ علامت ہے کہ دین مقصود ہے۔

ہاں یہ بھی دیکھا جاوے گا کہ اس شخص سے دونوں جگہ دین کا نفع برابر ہے یا دوسری

(۱) نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے۔

جگہ زیادہ ہے۔ اگر اس سے دوسری جگہ کو ترجیح ہے تو اور بات ہے بشرطیکہ قصد دین کا ہو۔ ورنہ اگر دوسری جگہ کو نفع دینی زیادہ ہو مگر مقصود اس کا یہ نہیں بلکہ مقصود تو ہے ترقی دنیا اور نفع دینی کو آڑ بناتا ہے۔ تو اس شخص کی نسبت کہا جاوے گا کہ یہ ملازمت محض دنیا کے لیے کرتا ہے دین کے لیے نہیں کرتا۔ دین کے لیے ملازمت وہ ہے جس میں عزم دین کا ہو۔ اس کو ہر شخص دل میں ٹٹول کر دیکھ لے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ میں محض لفظی نیت سے کام نہیں چلتا۔

لفظی وخیالی نیت

جیسے ایک دفعہ کانپور میں میں مسافرانہ طور سے گیا ہوا تھا اور دوسری جگہ جانے کو تیار تھا، ٹکٹ لینے کے لیے آگے آدمی کو بھیج دیا اور خود عشا پڑھ کر جانے کو تھا۔ عشا کی امامت کے لیے مجھے کہا گیا میں نے کہا اگر کوئی مقیم پڑھادے تو بہتر ہے شاید بعض مقتدی امامت مسافر کے مسائل سے ناواقف ہوں۔ تو ایک صاحب فرماتے ہیں کہ تم اقامت کی نیت کر کے پوری نماز پڑھادو۔ تو ظاہر ہے کہ وہ نیت لفظی یا خیالی نیت ہوتی۔ حقیقی نیت نہ ہوتی۔ غرض محض تصور سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ تصور نیت نیت نہیں۔ جیسا تصور کفر کفر نہیں بلکہ عزم کفر کفر ہے۔ اسی طرح تصور ریاء ریاء نہیں بلکہ عزم ریاء ہے۔

بہرحال مقصود کو دیکھنا چاہیے اور ہر شخص اپنے وجدان کو دیکھے کہ اس وقت جہاں تنخواہ پر کام کر رہا ہے اگر دوسری جگہ اس سے زیادہ ملے تو چلا جاوے گا یا نہیں۔ اگر زیادہ ملنے پر بھی نہ جاوے تو معلوم ہوگا کہ یہ شخص حسبۃ للّٰہ کام کرتا ہے ورنہ اجیر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اجرت لینے میں گناہ نہ ہو کیونکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جواز کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نے اس پر فتویٰ دے دیا ہے مگر گفتگو اجر وثواب میں ہے۔ یہ میری رائے ہے اگر غلطی ہو تو مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفقہ قاضی کے طور پر تنخواہ لیتا ہے اس کو اجر ملے گا، ورنہ نہیں۔

شبہ کا جواب

اب صرف ایک شبہ اور رہ گیا وہ یہ کہ جب یہ نفقہ قاضی کی مثل ہے تو پھر تنخواہ کا تعین نہ کریں۔ جواب یہ ہے کہ تعین تنخواہ محض رفع نزاع کے لیے ہے کیونکہ اصل معیار تو

رفع حاجت ہے اور حاجت کبھی کم ہوتی ہے کبھی زیادہ، اور دراصل اس میں معتبر قول صاحب حاجت کا ہے۔ شاید کسی کو اس پر شبہ ہوتا۔ کہ ممکن ہے کہ حاجت پانچ روپے کی ہو اور اس نے بتلادیئے دس روپیہ، پھر نزاع ہوتا اس لیے مصلحت یہ ہے کہ تعین ہوجاوے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نفقہ زوجہ کو اس میں بھی اصل عدم تعین ہے کیونکہ وہ اجرت نہیں، بلکہ حق واجب ہے اور اصل معیار اس کا حاجت ہے چنانچہ قبل فرض قاضی بھی اس کا ادا کرنا واجب ہے لیکن بعض دفعہ مصلحت عدم نزاع کے لیے قاضی نفقہ کی مقدار معین کردیتا ہے اور ظاہر ہے فرض قاضی کے بعد بھی وہ نفقہ ہی ہوتا ہے اجرت نہیں ہوجاتی۔ پس اگر تعین منافی ثابت ہوتی تو چاہیے کہ نفقہ زوجہ بعد فرض کے نفقہ نہ رہے۔ بلکہ اجرت ہوجائے اور اس کا کوئی قائل نہیں۔ یہ اجمالی جواب ہے۔ واللہ اعلم بتفاصیلہٖ۔ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اصلاح کردی جائے۔ غرض تنخواہ لینے کے بعد بھی بعض صورتوں میں اجر ملتا ہے۔ جب اجر ملتا ہے تو پھر نیت تبلیغ کی کیوں نہ کی جائے۔ پس مدرسین وطلبہ تبلیغ کا ثواب سن کر پڑھنا پڑھانا نہ چھوڑیں۔ بلکہ وہ اس میں نیت تبلیغ کرلیں۔

اقسام تبلیغ

اور اگر تبلیغ کی قسمیں کردی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے کفار کو، دوسری قسم تبلیغ فرع ہے مسلمانوں کو۔ تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا۔ پھر تو درس وتدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں تو اب یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے۔ بلکہ اس کے لیے تقسیم خدمات ضروری ہے پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے۔ یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے۔ کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا۔ خود قرآن سے بھی تقسیم خدمات کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ(۱)

(۱) ’’اور ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو یہ بھی نہ چاہیے کہ جہاد کے واسطے سب کے سب ہی نکل کھڑے ہوں پس ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ حاصل کرتے رہیں‘‘ سورۃ التوبۃ: ۱۲۲۔

اس میں حق تعالیٰ نے سب کو دفعتاً جہاد میں جانے پر عتاب فرمایا ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ایک جماعت جہاد میں جاتی اور ایک علم حاصل کرتی۔ اس سے اس آیت میں بحث نہیں کی کہ اس تقسیم کے لیے مرجع کیا ہے۔ کس کو علم حاصل کرنا چاہیے اور کس کو جہاد میں جانا چاہیے۔ مگر اتنی بات ثابت ہوگئی کہ دونوں میں مشترک خدمات کو تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح جب تبلیغ کے اقسام ہیں تو کسی کو کوئی خدمت کرنا چاہیے۔ کسی کو کچھ کرنا چاہیے۔ سب ایک ہی کام نہ کریں کہ اس سے دین کی بنیادیں کمزور ہوجائیں گی۔ باقی یہ پھر کہوں گا کہ جو کچھ کرو اپنے بڑے سے پوچھ کر کرو۔ وہ متعین کردیں گے کہ کس کو کیا کرنا چاہیے۔ وہ جس کو پڑھنے کا حکم دیں وہ پڑھیں، جن کو تبلیغ متعارف کے واسطے مقرر کریں وہ مبلغ بنے، پھر تبلیغ کے اندر جس کو جو خدمت سپرد کریں وہ اسی کو انجام دے۔ مثلاً کسی کو مالی خدمت بتادیں گے کسی کو جانی، کسی کو تصنیف و تالیف کی۔ پس یہ مت سمجھو کہ یہ تبلیغ نہیں ہے یہ بھی تبلیغ ہی ہے کیونکہ مقدمات تبلیغ ملحق بالتبلیغ (۱) ہیں۔ پس یہ مال دہندہ بھی مبلغ ہے۔ اور احکام سنانے والا بھی مبلغ ہے اور مضامین لکھنے والا بھی مبلغ ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی سے پوچھو کہ تمہارے کھانے میں کیا صرف ہوتا ہے تو وہ پانچ روپے بتادے گا۔ مثلاً پھر اس کی تفصیل میں کوئلہ اور اپلہ (۲) کو بھی شمار کرے گا۔ مثلاً دو روپے کا اناج ہے اور ایک روپیہ کی دال اور چار آنے کے اپلے۔ اب اگر کوئی کہے کہ میاں ہم تو تم سے کھانے کا حساب پوچھ رہے ہیں تم اپلے کو اس میں کیسے شمار کرتے ہو تو کہا جاوے گا کہ یہ شخص معترض احمق ہے کیونکہ یہ بھی کھانے کے متعلقات میں سے ہے۔ کھانا بغیر لکڑی یا اپلے یا کوئلہ کے کیسے پک سکتا ہے۔ یہ تو عرف کے موافق کلام ہے اور قواعد شرعیہ سے بھی ثابت ہے کہ مقدمات شئ بھی اسی حکم میں ہوتے ہیں جو اصل کا حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۳)

معلوم ہوا۔ کہ معاونت بر بھی بر ہے (۴)۔ کیونکہ اس میں تعاون بامور بر کے اور

(۱) تبلیغ کے مقدمات تبلیغ ہی کے حکم میں ہیں (۲) بھینس کا گوبر سکھا کر جلانے کے لیے جو تھاپیاں بنائی جاتی ہیں ان کو بھی کھانا پکانے کے خرچ میں شمار کرے گا (۳) ''تقویٰ اور پرہیزگاری کے کاموں میں مدد کرو'' سورۃ المائدۃ: ۲ (۴) نیکی پر معاونت کرنا بھی نیکی ہے۔

ماموربہ کا بر ہونا لازم ہے۔ بہر حال تبلیغ کے متعلق متعدد خدمات ہیں۔ پس ایک جماعت ایسی ہو جو اشاعت اسلام کرے اور ایک جماعت ایسی ہو کہ مال سے ان کی امداد کرے وغیرہ وغیرہ۔

طلباء اور تبلیغ

میں نے اس کو مکرر اس لیے بیان کیا کہ ہم لوگوں میں کام کے وقت غلو ہو جاتا ہے کہ بس جدھر رخ کرتے ہیں سب ایک ہی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس لیے تبلیغ کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مدرسین وطلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں۔ بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ آیا سبق چھوڑ کر چلے جاویں یا پڑھتے رہیں یا ایک وہاں سے چلا آوے، دوسرا جاوے۔ غرض اپنی رائے سے کچھ نہ کرو۔ ورنہ بجائے اصلاح کے فساد ہوگا۔

میں نے اس کو قصداً عرض کیا ہے کیونکہ میں یہ رنگ دیکھ رہا ہوں کہ آج کل وہ طلبہ بھی جو علم سے فارغ نہیں ہوئے، تبلیغ میں مشغول ہونا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے لیے تکمیل علم اول ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یہ پڑھنا پڑھانا نہ ہو تو تصنیف وتبلیغ وغیرہ بھی سب بے کار ہے۔ کیونکہ ناقص کی تبلیغ وغیرہ کچھ قابل اعتبار نہیں۔ بلکہ اس طرح تو چند روز میں علم بالکل معدوم ہو ہی جاوے گا تو تعلیم وتعلم بھی ایک فرد ہے تبلیغ کی۔

درجات تبلیغ

اب دوسری بات کہتا ہوں کہ تبلیغ کی اس فرد کی طرف کچھ تو توجہ ہے۔ مگر اس کی جو دوسری فرد ہے(۱) یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اس کی طرف تو بالکل توجہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی ایک فرد اعظم ہے تبلیغ کی اور اس میں بھی ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب خاص ایک خطاب عام۔ امر بالمعروف خاص تو آپ کے ذمہ ہے، یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور امر بالمعروف عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے اور امر بالمعروف خاص کا

(۱) دوسری قسم۔

مدار قدرت پر ہے۔ یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ اس کو امر بالمعروف کرے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں، خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے، آقا کے لیے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر جوان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔ حدیث میں ہے: مروا اصبیانکم بالصلٰوۃ اذا بلغوا سبعاً، واضربوھم اذا بلغوا عشرا (۱)

غرض ہر شخص پر واجب ہے کہ اپنے ماتحتوں کو حکم کرے۔ امور خیر کا اور خلاف شرع باتوں سے روکے۔ اس میں عالم ہونے کی ضرورت نہیں، ہاں جہاں علم درکار ہے۔ مثلاً کوئی مختلف فیہ (۲) مسئلہ ہے یا ایسا کوئی مسئلہ ہے جس کے بہت شقوق ہیں اور وہ ان شقوق کا احاطہ نہیں کرسکا یا احاطہ تو کرلیا مگر درجہ معلوم نہیں کہ متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ (۳)۔ مسئلہ مختلف فیہ (۴) میں گنجائش ہوتی ہے تو ایسا مسئلہ بتلانا ہر شخص کے لیے جائز نہیں بلکہ جس کی نظر کافی نہ ہو اس کو ایسا مسئلہ بیان کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ علماء کے بتلانے کا ہے پس تبلیغ خاص کے لیے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔ خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو یا کسی عالم سے مسئلے مسائل سن سن کر عالم ہوگیا ہو۔ اس کو بھی تبلیغ عام کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لیے معین کیا ہو۔ چنانچہ صحابہ نے کہاں پڑھا تھا۔ وہ بھی تو سن سن کر تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہر شخص خود نہ سمجھے کہ میں اس کے قابل ہوں۔ جب تک کوئی کامل نہ کہہ دے کہ تم قابل ہو۔ بقول ایک حکیم کے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیقِ خرے چند (۵)

جاہل مبلغ

جیسے آج کل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل میں ایسی

(۱) ''اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہوجائیں اور جب وہ دس برس کے ہوجائیں اور (نماز نہ پڑھیں) تو انہیں مارو'' مسند احمد: ۲/ ۱۸۰، حلیۃ الأولیا: ۱۰/ ۳۶ (۲) اختلافی مسئلہ (۳) اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے یا اختلاف (۴) جس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو (۵) ''اپنا موتی کسی صاحب نظر کو دکھلا دے کیونکہ چند گدھوں کی تصدیق سے تم عیسیٰ نہیں ہوسکتے''۔

غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہاء نہیں۔ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔

ایک عالم حکایت فرماتے تھے کہ کسی مقام میں ایک واعظ آئے۔ وعظ میں اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ کا ترجمہ کیا۔ کہ اے محمد! دیا ہم نے تم کو مثل کوثر کے۔ان راوی عالم نے کہا کہ بھائی مثل کا ہے کے معنی ہیں۔تو فرماتے ہیں کہ یہ کاف کے معنی ہیں۔ یہ کاف تشبیہ کا کہلاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت یہ کاف تشبیہ کا نہیں ہے۔ یہ کاف خطاب کا ہے تو کہتے ہیں کہ کیا دلیل ہے کہ یہ تشبیہ کا نہیں خطاب کا ہے، اب وہ چکرائے کہ اس جاہل کو کیسے سمجھائیں۔سوچ کر کہا کہ وہ گول گول لکھا جاتا ہے۔ جب الف سے ملا ہوا ہو اور یہ ایسا نہیں۔ کہا ہاں! مجھ کو معلوم نہ تھا پھر بھی غنیمت ہے کہ اس نے اتنا بھی مان لیا۔ ورنہ کہتا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ گول گول ہوتا ہے۔ اگر کہتے کہ استاد نے بتلایا ہے، کہتا کیا دلیل ہے کہ استاد نے بتلایا اور پھر استاد ہی کو نہ مانتے تو کوئی کیا کر لیتا۔ مگر پھر بھی اس میں دین کی اہلیت تھی کہ اس نے اپنی غلطی کو مان لیا ورنہ اب تو یہ حالت ہے کہ جو بات منہ سے نکل جاتی ہے، خواہ وہ بالکل ہی غلط ہو مگر غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے۔تو آج کل ایسے ایسے جاہل بھی وعظ کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

خود یہاں دیوبند ہی کی میرے سامنے کی حکایت ہے کہ ایک جاہل اندھا واعظ آیا۔ اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان ہی کی مسجد کا قصہ ہے۔ بعد مغرب وعظ شروع کیا۔ وعظ میں یہ آیت پڑھی: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۔(۱)

آیت کے اول جزو کا ترجمہ تو قریب قریب ٹھیک بیان کر گئے۔ آگے دوسرے جزو میں تماشا کیا ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ(۲) کا آپ نے یہ ترجمہ کیا کہ یہ بہتر ہے تمہارے لیے کہ دوکان کو تالا لگا دو۔ آپ نے تعلمون کی گت بنائی۔ اس کو تالا موند(۳) سمجھا۔ مگر قرآن میں تو مون ہے موندنا کہاں۔ مگر شاید وہ کہتا

(۱)''اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لیے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (نماز وخطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید وفروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم کو کچھ سمجھ ہو'' جمعہ:۹ (۲)''یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو سمجھ ہو'' (۳) تالہ بند کرو۔

کہ یہ موں مرخم ہے موند کا۔ حالانکہ موندنا اس معنی میں مستعمل بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ کیواڑ بند کرنے کو موندنا کہتے ہیں نہ کہ تالا لگانے کو۔ مولانا کو غصہ آیا پوچھا کہ یہ ترجمہ تو نے کہاں سے سیکھا۔ تو سیکری میں (۱) ایک شخص بہت ظریف تھے ان کا نام مولوی صادق علی تھا کہا کہ مجھ کو مولوی صادق علی نے یہ ترجمہ بتلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا ارے اس نے تجھے پٹوانے کو ایسا ترجمہ بتلایا ہے۔ تو اگر ایسے لوگوں کو وعظ گوئی کی گنجائش دی جائے تو بڑا مفسدہ پھیلے گا۔ مگر ہاں بعض ان پڑھ بھی صاحب کمال اور دیندار فہیم ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور باوجود اس کے اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاوے اور ان کو معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ان کو وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔ اب تو یہ مصیبت ہے کہ جو لوگ نام کے مولوی بھی ہیں اور بدوں تحقیق مسئلہ بتلانے کی وعید بھی جانتے ہیں ان کو بھی یہ کہتے ہوئے عار آتی ہے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ بس ان سے جو بات بھی پوچھی جاوے فوراً بتلانے کو تیار اور گڑ بڑ کر کے جواب دے دیتے ہیں۔ ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک بالکل بددین اور ایک کچھ دین دار ہیں وہ گول گول جواب دیتے ہیں کہ مخاطب کو جواب کا کچھ پتہ ہی نہ چلے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کو مسئلہ معلوم نہیں۔ وہ اس طرح اپنی جہالت کو چھپاتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ گنگوہ میں ایک جاہل مفتی تھے۔ مولانا نے امتحاناً ان سے پوچھا کہ حاملہ سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ مولانا نے مسئلہ بھی چھانٹ کر وہ پوچھا جو بہت ہی شقوق رکھتا ہے مگر وہ شخص تھا متدین۔ یہ جواب دیا کہ بیوہ حاملہ سے نکاح کرنا ایسا ہے جیسے گھیرا دے دینا۔ پوچھا کہ مطلب کیا ہے۔ کہا تم خود سمجھ لو۔ غرض وہ بڑا ہوشیار تھا۔ جواب ایسا دیا کہ مخاطب کو کچھ پتہ ہی نہ چلے، نہ حلت کا پتہ لگے نہ حرمت کا اور نہ عقیدہ بگاڑا۔ مگر سائل کو کیا حاصل ہوا بجز اس کے کہ متحیر رہے۔ مگر خیر پہلے کچھ تو اہلیت تھی۔ اب تو من گھڑت سے بھی باک نہیں۔ کوئی کچھ ہی پوچھے جواب تراش کر کے کہہ ڈالا خواہ غلط ہی ہو تو ایسوں کو تو وعظ کہنا حرام محض ہے۔ البتہ کوئی جاہل اچھے حافظہ والا ہو اور اس کے اندر تدین بھی ہو اور کوئی عالم اس کو اجازت دے۔ تو اس کو وعظ کہنا جائز

(۱) ایک جگہ کا نام ہے۔

ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ عالم پہلے اس کو متعدد تقریریں بھی سن لیں پھر اجازت دیں۔

مولانا عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں ایک امی شخص وعظ کہتا تھا مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو ازبر یاد کر لیتا تھا تو ایسے شخص کو اجازت ہے۔ جب کہ ہر پہلو سے یقین ہوجاوے کہ قوی الحافظہ ہے، متدین ہے اور اسکے دین کی بھی جانچ کر لی ہو۔ جیسے ڈاک خانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک کے خانہ میں اپنے نام کے خطوط چھوڑ چھوڑ کر ڈاکیہ کی جانچ کے لیے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھواؤ۔ پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ہیں ان کا کیا جواب دیتا ہے۔ اگر کہہ دے کہ معلوم نہیں تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے۔ اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لیے متعین کیا جائے تو جائز ہے۔ مگر اس کے لیے حدود مقرر کر دو کہ اس حد تک کام کرو آگے نہ بڑھو۔ آخر دنیا کے بھی تو ہر کام کی ایک ایک حد ہے کہ اس حد سے تجاوز جائز نہیں رکھا جاتا۔

ہر فرد امت کے ذمہ دعوت

غرض اس طریقہ سے سب کو تبلیغ میں مشغول ہونا چاہیے جس سے جتنا ہوسکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کسی کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ میں عام حکم دے دیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور کو ہے تو مقصود خاص حضور کو خطاب کرنا نہیں ہے، بلکہ عام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ (۱) اس تفسیر پر انا ضمیر ادعوا کی تاکید ہے اور من اتبعنی اس پر معطوف اور گو علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت ہوں اور میرے متبعین بھی۔ اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا۔ یعنی علی بصیرۃ خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے مبتداء مؤخر اور ادعوا کا معمول نہ ہوگا۔ مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عتاب عام کرے گا اور آپ نے

(۱) ’’(اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے) کہ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بصیرت کے ساتھ دعوت کرتے ہیں‘‘۔

استشہاد کے لیے یہ آیت پڑھی وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۱) نیز حضور نے فرمایا ہے کہ پہلی امتیں امر بالمعروف کے ترک سے ہلاک ہوئی ہیں اور امم سابقہ کے حالات نقل کرکے اگر اس پر نکیر نہ کیا جائے تو وہ بھی حجت ہے اور سنئے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے صید کے قصہ میں فرمایا ہے: وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا۔(۲) انہوں نے جواب دیا: قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ ۔خدا کے یہاں عذر قائم کرنے کے لیے تاکہ معذور سمجھے جائیں کہ ہم نے تو ان سے ترک معصیت کے لیے کہا تھا۔ مگر انہوں نے نہیں مانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ بلکہ امتی کے ذمہ بھی امر بالمعروف ضروری ہے اور حکم سب کو عام ہے۔ ہاں اس میں وہ تفصیل کہ کس کے ذمہ کیا حکم ہے۔ یعنی تبلیغ خاص ہے یا عام ہے۔ سو اس کو میں نے اوپر بیان کردیا ہے کہ تبلیغ عام، علماء کا منصب ہے۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے۔ بہرحال حکم عام ہے باقی خطاب کا خاص ہونا خصوصیت مقام سے ہوتا ہے بلکہ اکثر جگہ قرآن میں خطاب خاص ہی ہے۔ لیکن جب آپ کسی کے حکم کے مامور ہیں تو اور سب بطریق اولیٰ مامور ہوں گے جب کوئی دلیل تخصیص کی نہ ہو۔

چنانچہ قاعدہ ہے کہ سلاطین کا خطاب اول بڑوں کو ہوا کرتا ہے اور چھوٹے ان کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ جب مقربین کو کسی بات کا حکم ہے تو غیر مقربین پر تو فرض متحتم ہوگا۔ پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۳) اس میں سبیل رب کی طرف بلانے کا حکم ہے۔

طریق دعوت

اب رہا یہ کہ طریقہ کیا ہے دعوت کا۔ سو اس کے متعلق حق تعالیٰ نے تین چیزیں

(۱) ''تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کے حکم میں داخل ہے'' سورۃ الانفال: ۲۵
(۲) ''یعنی بعض صلحاء نے دوسروں سے کہا تھا کہ ان نافرمانوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو (جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں یا سخت عذاب دینے والے ہیں'' سورۃ الاعراف: ۱۶۴ (۳) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف بلایئے حکمت اور مواعظ حسنہ کے ساتھ اور (بوقت ضرورت) احسن طریق سے ان سے مجادلہ بھی کیجئے''۔

بتلائیں ہیں (۱) دعوت بالحکمۃ (۲) دعوت بالموعظۃ الحسنۃ (۳) اور ایک مجادلہ۔ یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے۔ دوسری قسم یہ ہے موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حسنہ کیا جائے۔ اس کی توجیہ مختلف ہوسکتی ہے۔ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ جب کسی کو سبیل رب کی طرف دعوت ہوگی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی جو کہ مذہب مخالف ہے۔ پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال۔ تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعویٰ پر علمی دلائل قائم کئے جاویں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعی کو باطل کیا جاوے۔ اصل مقصود تو یہ دونوں ہیں۔ باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ موعظہ حسنہ ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد(۱) کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے۔ اس لیے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتلادیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پوری کردیتا ہے، دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے نہ صرف حکم کا پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوالوں۔ اس لیے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے۔ تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں۔ پھر حضور جیسا کوئی خیر خواہ نہیں۔ تو محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں تو موعظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا۔ سو وہ ایسے مضامین میں مؤثرہ ہیں، جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو، دل پگھل جاوے اور ان مضامین مرقعہ کا

(۱) بندوں کے ساتھ۔

مصداق ترغیب وترہیب ہے، کہ درجات جنت کی ترغیب اور درکات جہنم سے ترہیب کرنا ونحو ذٰلك (۱)۔غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے۔خواہ اصل ہوں یا فروع۔

ضرورت ترغیب وترہیب

باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لیے ترغیب وترہیب کا بھی ہے۔ گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے۔مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں ہے۔مگر دوسری حیثیت سے ترغیب وترہیب ہے یعنی جہاں احکام سنانا اور جنت ودوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو۔ صرف ترقیق قلب (۲) مقصود ہو وہاں ترغیب وترہیب ہے۔مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھوگے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے، یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائش ہیں۔ اور اگر نہیں پڑھوگے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب وترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا (۳)۔اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت قبول احکام کی پیدا ہوگی۔پھر عمل کرنے کی توفیق ہوگی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے۔ کیونکہ طبیعت کے خلاف کام ہے۔ اس واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہیے۔طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلاطمع (۴) یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا۔ پھر عادت ہوجاتی ہے تو ترغیب وترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔اس لیے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی۔

شفیق کی تعلیم

شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے۔مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر سے روکتا ہے تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا، حاکمانہ حق ادا کرنے کے لیے کافی ہے۔آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے۔مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے، دست آور ہے، اسے مت کھانا۔ یہ

(۱) جنت کے درجات کی ترغیب دی جائے اور دوزخ کے گڑھوں سے ڈرایا جائے (۲) دل نرم کرنا (۳) دل نرم کرنے والا ہے (۴) بغیر لالچ۔

پیٹ میں درد پیدا کردے گا، اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئیں گی۔ تو اتنا لگنا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لوگے تو تم کو یہ دوں گا، وہ دوں گا۔

خود میرا ایک واقعہ ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا۔ مگر میں پیتا نہ تھا تو والد صاحب نے کہا اگر دوا پی لوگے تو تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپے کے لالچ میں پی گیا۔ تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب وترہیب کی۔ کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بلا ترغیب وترہیب کے امتثال (۱) امر کرلیں۔ گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب وترہیب کے بھی کر لیتے ہیں۔ جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لو لم یخف اللّٰہ لم یعصی۔ کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا۔ تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہوجاتا ہے۔ لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے ماردھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لیے اپنے پاس سے بھی خرچ کرنا پڑے، جب بھی نہ چھوڑے تو اس لیے ترغیب ترہیب کی ضرورت ہے۔ یہ موعظہ حسنہ ہے۔

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے۔ کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کردیا۔

رعایت مخالف

اس کے بعد ارشاد ہے۔ جادلھم یعنی اس سے مجادلہ کیجئے۔ اس میں دو احتمال تھے، ایک مجادلہ حسنہ کا (۲)، ایک سیئہ کا (۳)۔ اس لیے احسن کی قید لگادی اور مجادلہ سیئہ سے ممانعت کردی۔ رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں۔ کیوں کہ اپنے

(۱) احکام کی بجا آوری (۲) اچھے انداز میں بحث کرنا (۳) برے انداز میں بحث کرنا۔

دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعوے کو رد کرنے میں بھی اسے کبھی انقباض ہوتا ہے (۱)۔ اس لیے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو۔ جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو۔ سبحان اللہ! کس قدر شفقت ہے عباد پر (۲) کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف (۳) ہو جائے، مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے۔

اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لیے ہے کہ بعض دفعہ جواب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم (۴) پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے۔ اس لیے چاہیے کہ کہے تو صاف صاف۔ مگر احسن طریقہ یہ ہے چنانچہ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ کا یہی مطلب ہے کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی۔ جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر اس کا اثر برا ہوتا ہے کہ مخاطب جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بات صاف ہو۔ مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

قُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ کا یہی مطلب ہے کہ سخت الفاظ سے بچو۔

باریک ادب

اب ایک باریک ادب تبلیغ کا اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ تبلیغ کر کے ظہور نتیجہ وحصول ثمرہ کی فکر میں نہ پڑنا چاہیے۔ بعض دفعہ اس سے بہت برا اثر ہوتا ہے اور یہ بالخصوص مبلغ شفیق کو پیش آتا ہے۔ جادلہم تک تو یہ معلوم ہوا کہ تبلیغ شفقت کے ساتھ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تبلیغ کے بعد بھی شفقت کی وجہ سے اس کی فکر میں لگے رہو۔ اس میں ایک غامض ہے (۵)۔ جس کو لوگ کمال سمجھتے ہیں اور ہے واقع میں نقص اس سے تبلیغ کے اندر نقصان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب شفقت زیادہ ہوتی ہے تو نتیجہ عاجلہ (۶) پر نظر ہوتی ہے مگر اس نتیجہ کو اول سوچ لیتے ہیں کہ اس کا یہ اثر ہوگا حالانکہ اصل نتیجہ رضائے حق ہے اور وہ تبلیغ بطریق مذکور (۷) پر فوراً مرتب ہو جاتا ہے اور ثمرہ عاجلہ بھی اگر ہوتا ہے اسی کی

(۱) کبھی دل تنگ ہوتا ہے (۲) بندوں پر (۳) حقیقت تو کھل جائے (۴) فریق مخالف پر (۵) جو مشکل سے سمجھ میں آئے (۶) فوری نتیجہ پر (۷) مذکورہ طریقہ پر تبلیغ کرنے پر۔

برکت سے مرتب ہوتا ہے۔ مگر ہم لوگوں کے اندر عجلت (۱) زیادہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جلدی اثر ہوجائے۔ گواس میں نیت دین ہی کی ہو۔ مثلاً کسی کونماز سکھاتے ہیں تو اس کا ثمرہ عاجلہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھ سے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیں۔ اسی طرح تبلیغ اسلام میں یہ چاہتے ہیں کہ ہماری تحریک کے ساتھ ہی بہت سے مسلمان نظر آنے لگیں اور اس میں بعض وقت یہ مصلحت بھی نیت میں ہوتی ہے کہ اس سے اہل حق کا مجمع زیادہ ہوگا اور حق بڑھے گا تو حق کو قوت ہوگی اور جب اہل حق کو قوت ہوگی تو اہل باطل مغلوب ہوں گے تو وہ مضر (۲) بھی نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ مصلحت پیش نظر ہوتو یہ دین ہے۔ مگر اس میں غلو نہ چاہیے۔

اور اگر ثمرہ دنیا ہے۔ مثلاً یہ کہ ہمارا نام ہوگا کہ یہ خوب کام کرتا ہے تو وہ تو ہے ہی برا، اگر چہ بصورت نماز ہی ہو۔ غرض بعض وقت ثمرہ دینی ہوتا ہے اور کبھی دنیاوی۔

شفقت میں غلو کا نتیجہ

مگر یہ سب ثمرات عاجلہ ہیں (۳)۔ جن پر بعض مبلغین کی نظر ہوتی ہے۔ پھر اگر ان ثمرات کا ترتب (۴) نہیں ہوتا تو حزن وملال (۵) ہوتا ہے اور بعض وقت یاس (۶) تک نوبت آجاتی ہے اور مخاطب پر غیظ (۷) پیدا ہوتا ہے اور حاضر یا غائب برا بھلا کہتے ہیں کہ جانالائق! تجھے اس قدر سمجھایا، اتنی کوشش کی مگر تو نے سمجھا ہی نہیں میرے اوقات کو ضائع کیا۔ اپنی محنت ہی رائیگاں گئی اور اگر اس پر قدرت ہوتی ہے تو کبھی اس کو سزا بھی دے دیتے ہیں اور وہ بھی اعتدال سے زیادہ اور بعض وقت دل تنگ ہوکر بیٹھ جاتے ہیں کہ جا بھاڑ میں پڑ، کام چھوڑ بیٹھتے ہیں یہ اثر ہوا ثمرات پر نظر ہونے سے۔

بظاہر تو جب مبلغ کو محزون اور غمگین (۸) دیکھا جاتا ہے۔ اس کا بڑا ہی کمال سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا مبلغ شمار کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا کمال ہوگا کہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہے اور دوسروں سے بھی کہہ رہے ہیں کہ بھائی اس کے لیے دعا کرو۔ کہ اس کی اصلاح ہوجائے۔ مثلاً اگر اپنا بیٹا نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سمجھاتے ہیں۔

(۱) جلد بازی (۲) نقصان (۳) یہ سب فوری نتائج ہیں (۴) یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے (۵) غم وافسوس (۶) مایوسی (۷) غصہ (۸) افسردہ وغمگین۔

کڑھتے ہیں، دل سے دعا کرتے ہیں، اوروں سے بھی دعا کراتے ہیں۔ کسی سے کہتے ہیں اجی! ایک تعویذ ہی کردو۔ یہ سب افعال گو محمود ہیں مگر جب غلو ہوجاتا ہے تو اس کا اثر برا ہوتا ہے کہ اس کا انجام یاس اور یاس کا انجام تعطل ہوتا ہے۔ تو جس کو آپ نے تبلیغ کا فرد کامل سمجھا تھا۔ اب وہ مفضی الی التعطل وترك التبليغ ہوگیا(۱) اور تبلیغ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تو یادرکھو جو درجہ شفقت کا ایسا ہوگا۔ وہ کامل نہیں، بلکہ ناقص ہے، حاصل اس ادب کا یہ ہوا کہ ثمرات کے مرتب نہ ہونے سے محزون نہ ہو(۲) ایک طبعی حزن (۳) ہوتا ہے اس کا تو مضائقہ نہیں۔ بلکہ اس میں ثواب ہوگا اور یہ کہ اس میں غلو اور مبالغہ ہوجائے۔ کہ ثمرہ مرتب نہ ہونے سے ہمت ہی توڑ دے اور روتے روتے آنکھیں پھوڑ دے یہ برا ہے۔ نصوص کے تتبع سے (۴) معلوم ہوتا ہے کہ اتنے حزن وملال کی اجازت بھی نہیں۔ حق تعالیٰ جل مجدہٗ فرماتے ہیں: وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ۔ (۵)

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اور لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ (۶) اور وَمَآ أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ۔ (۷) اور فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ (۸)۔

یہ سب آیات مبالغہ فی الحزن (۹) سے منع کرتی ہیں۔ یعنی اتنا حزن جس سے اپنی صحت ہی برباد ہوجائے یا کام سے تعطل ہوجائے اس کی اجازت نہیں۔ کوشش کی ممانعت نہیں اس کا تو حکم ہے۔ مگر عدم ظہور نتائج پر اس درجہ کا حزن مضر ہے (۱۰)۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جادلهم کے بعد اس ضرر کا تدارک (۱۱) کیا، عجیب فرماتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ۔ (۱۲)

(۱) اس نے آپ کو تبلیغ کرنے سے روک دیا (۲) غمگین (۳) غم (۴) قرآن وحدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے (۵) ''اور نہ ان پر غم کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہوجایئے'' (۶) ''شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے ہوئے) اپنی جان دے دیں گے'' (۷) ''اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مختار ہیں'' (۸) ''تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو، پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو'' سورۃ الانعام: ۳۵ (۹) غم میں زیادتی (۱۰) نقصان دہ (۱۱) نقصان کا سد باب (۱۲) ''بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں'' سورۃ النحل: ۱۲۵۔

یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو۔ یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ یہ بھی ایک درجہ ربط ہے ماقبل کو مابعد سے اور ممکن ہے اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آجاوے۔ تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے۔ یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے (۱) اس کے تدارک کے لیے فرمایا۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ الایۃ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف بلایئے) اور ایک افراط فی التبلیغ (۲) سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ (۳)

غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراد ہو جاتا ہے، کبھی تفریط۔ یہ دونوں مضر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا۔ یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط (۴)، چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے۔ آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یاس کی نوبت آجاتی ہے۔ اس کے بعد تعطل ہو جاتا ہے (۵)۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے کیا بحث۔ ثمرہ ہو یا نہ ہو۔ آپ اپنا کام کئے جایئے۔ ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے۔

ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اس کو بیان فرمایا ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ۔ (۶)

جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ سو نفس حزن کی ممانعت نہیں، وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے۔ اس

---

(۱) تبلیغ میں زیادتی سے (۲) تبلیغ میں کمی (۳) ''بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں'' (۴) نہ کمی کرنا نہ زیادتی (۵) چھوڑ کے بیٹھ جاتا ہے (۶) ''اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے پس (جب یہ بات ہے تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان لے لے آئیں'' سورۃ یونس: ۹۹۔

میں انسان مجبور ہے۔ بلکہ ممانعت اس کی ہے جو حد ضیق (۱) تک پہنچے۔ اس لیے فرماتے ہیں: اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ۔ (۲)

آپ کو اس سے کیا کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا اس کو اللہ جانتا ہے آپ اس کی فکر نہ کیجئے اس کو خدا کے سپرد کر دیجئے۔ اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لیے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں۔ اس کی بھی ممانعت فرمادی ہے۔ وَقُلۡ لِّعِبَادِىۡ يَقُوۡلُوا الَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ (۳)۔

غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لیے کافی ہوگئیں۔ امید ہے کہ اب بقدر ضرورت بیان کافی ہوگیا ہے۔

مسلمات سے جواب

ایک مضمون اور رہ گیا۔ اس کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ مقدمہ مقصود کا مقصود ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ فقہی مسئلہ ہے۔ مقدمۃ الواجب واجب (۴) تو اس وقت جن چیزوں کا تبلیغ کے لیے موقوف علیہ ہونا ثابت ہوجاوے۔ خواہ لو لاہ لامتنع (۵) کے درجہ یا مصحح لدخول الفاء کے درجہ میں۔ مثلاً وہ امور جن کو اہل بصیرت بتلاویں کہ تبلیغ کے لیے ان کی بھی ضرورت ہے تو ان کا اتباع کرکے ان مقدمات کو بھی جمع کریں۔ بشرطیکہ شرعی حدود سے باہر نہ ہو۔ چنانچہ اولاً خط کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا اور اب یہاں آکر دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہاں مدرسہ میں سنسکرت کی تعلیم دی جارہی ہے۔ تو ہر چند کہ سنسکرت کا سیکھنا وجوب کے درجے میں نہیں۔ مگر تبلیغ میں بے حد مفید ہے۔ اس سے معاندین اسلام کے مذہب پر کما حقہ اطلاع ہوگی اور انہی کی کتب سے ان کا جواب دیا جاوے گا تو بڑا کارگر ہوگا۔ خصم ہی کے مسلمات (۶) سے جواب دینا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے وہ ساکت اور دنگ ہوجاتا ہے (۷)۔ چنانچہ بہت جگہ دیکھا گیا ہے کہ

---

(۱) جس سے دل تنگ ہونے لگے (۲) ''بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتے ہیں'' (۳) ''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے (مسلمان) بندوں سے کہہ دیجئے کہ ایسی بات کہا کریں جو بہتر ہو'' (۴) واجب کا مقدمہ بھی واجب ہے (۵) اگر وہ کام نہ ہو تو یہ کام نہیں ہوسکتا (۶) فریق مخالف کے تسلیم شدہ اصول سے جواب دینا مفید ہوتا ہے (۷) خاموش وحیران رہ جاتا ہے۔

الزامی جواب جس قدر مفید ہوتا ہے تحقیقی معاند(۱) کے لیے اتنا شفا بخش نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک درجہ ہے تبلیغ کا اس سے خصم بالکل ہی چپ ہو جاتا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے مجمع کے اوپر اثر زیادہ پڑتا ہے۔ عوام اس کو نہیں دیکھتے ہیں کہ کس کی تقریر کیسی ہے ان کے نزدیک تو جس نے ساکت کر دیا بس وہی جیتا۔ وہ تو مسکت (۲) ہونے کے وصف کو ہی دیکھتے ہیں، دلیل کی حقیقت کو نہیں دیکھتے ہیں۔ تو بر بنائے مقدمۃ الواجب واجب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر واجب نہیں تو آپ کے نزدیک استحباب ہی کے درجہ میں سہی مگر مفید تو ہے اور یہ عذر کرنا کہ سبق کا حرج ہوتا ہے۔ اجی سبق کے وقت میں اس کا شغل نہ کیجئے۔ بلکہ فضول گوئی میں جو وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میں اس کام کو کیجئے۔

تبلیغ میں اہل بصیرت سے رائے

اور ایک مقدمہ تبلیغ کا اور ہے یعنی تقریر کی مشق، وہ بھی کیجئے۔ بحمداللہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور سامان بھی مدرسہ میں موجود ہے۔ اس کو غنیمت سمجھیے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا۔

ایک حکایت یاد آئی ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی نے ان کے کمال کی تعریف کی تھی تو آپ نے تواضعاً فرمایا کہ میاں ہماری مثال تو ایسی ہے جیسا رڑ کی گودام کا کاریگر کہ جب تک گودام میں ہے کاریگر ہے جہاں باہر نکلا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس گودام میں مشین کے ذریعہ سے سب کام ہوتے ہیں، ایک چیز ایک کل (۳) میں لگا دی۔ تو اس نے اسے کاٹا، دوسری کل نے اسے ہتھوڑا مارا، تیسری نے بنا بنایا ایک جگہ رکھ دیا۔ ایسے ہی ہمارا کمال ہے کہ جب تک مدرسہ کے اندر ہیں، سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے کچھ بھی نہیں، خیر مولانا کی شان تو ایسی کیوں ہوئی، مگر ہماری حالت تو واقعی یہی ہے کہ مدرسہ ہی ہمارے کمالات کا موقع ہے۔

صاحبو! ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہیں آوے گا اور وقت بھی نہیں ملے گا۔ اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع

(۱) ضدی مخالف کے لیے تحقیقی جواب اتنا مفید نہیں ہے جتنا الزامی ہے (۲) ایسا جواب جو خاموش کر دے (۳) مشین، آلہ

کردو۔ بلکہ ہر چیز کو اپنے درجے میں رکھ کر حاصل کرو۔ اصل مقصود تو دین ہے۔ مگر اس کے حاصل کرنے کے طریقے ہیں۔ قرآن کا صحیح کرنا بھی دین ہے۔ حدیث تفسیر پڑھنا بھی دین ہے۔ اسی طرح فقہ بھی دین ہے۔ سب پر نظر رکھنا چاہیے۔ مگر ترتیب سے کرنا چاہیئے۔ اور ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس کو کتنی مقدار میں حاصل کرنا چاہیے اور یہ اساتذہ کی رائے پر ہے وہ جس کی استعداد جیسی دیکھیں گے، اس کی صلاحیت کو سمجھ کر خود رائے دیں گے، پھر وہ جو رائے دیں، ویسے ہی کرو۔ میرے پاس بعض طلبہ کے خطوط آتے ہیں کہ ہم کو منطق نہیں آتی۔ میں لکھ دیتا ہوں۔ اذا لم تستطع شیئا ندعہ جس کو حمد اللہ [(۱)] نہ آوے۔ الحمد للہ پڑھ لے اور جس کے لیے منطق دین میں مفید سمجھی جاوے اس کے لیے وہ بھی دین ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی نے فلسفہ منطقی کی کتابیں درس سے خارج کردی تھیں تو ایک طالب علم نے مولانا محمد یعقوب صاحب سے کہا لیجئے حضرت! معقول پڑھنا بھی مولانا نے حرام کردیا۔ اس نے اعتراض کے طور پر کہا تھا، مولانا نے فرمایا کہ بھائی مولانا نے حرام نہیں کیا، تمہاری طبیعتوں نے حرام کیا ہے، تمہارے فہم میں کجی آ گئی ہے، اس لیے ممانعت کی جاتی ہے اور ہم تو جیسے بخاری میں ثواب سمجھتے ہیں، ویسا ہی امور عامہ [(۲)] میں، اتنا بڑا دعویٰ اطمینان کا یہ مولانا ہی جیسے کا کام ہے، غرض ہر شخص کا الگ حال ہے جس کو اساتذہ وکاملین سمجھتے ہیں۔ اس لیے سب کے ساتھ ایک برتاؤ نہیں کرتے۔ میرے پاس ایک خط آیا کہ مجھ کو عربی نہیں آتی۔ میں نے لکھا کہ چھوڑ دو۔ اردو میں مسائل پڑھو، پنجابی، کابلی، بنگلہ جو زبان بھی آوے اسی میں پڑھ لو۔ کوئی عربی پڑھنا فرض تھوڑا ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ کس کو کیا کرنا چاہیے اور کتنی مقدار کرنا چاہیے۔ یہ اساتذہ کی رائے پر ہے۔ کیونکہ ہر ایک کی حالت جدا ہے۔ استعداد جدا ہے، سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔

تبلیغ میں خودرائی

غرض اپنی رائے سے افراط تفریط مت کرو۔ ہمارے اندر بڑی خرابی یہ ہے کہ یا تو کسی کام پر بالکل توجہ ہی نہیں اور یا متوجہ ہوئے تو سب کے سب ایک ہی طرف ٹوٹ

(۱) کتاب کا نام ہے (۲) نام کتاب۔

پڑے، چھوٹے بڑے سب اس میں منہمک ہو گئے۔ اور سب کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔
اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی　　چونکہ خوردی تندو بدرگ می شوی(۱)

اور کسی اردو کے شاعر نے کہا ہے:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

وہی مثال ہے ہماری کہ "کنویں سے نکلے کھائی میں گرے" غرض ہمارے کاموں میں گڑ بڑ بہت ہے، اعتدال اور استقامت بالکل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب خودرائی پھیل گئی ہے، یہ بڑا مرض ہے۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرے بڑے سے پوچھ کر کرے۔ بلکہ اکابر بھی چھوٹوں کو مناسب ہے کہ مشورہ میں شامل کرلیا کریں اور یہ سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور اس خودرائی کو صوفیاء تو سخت ہی مضر فرماتے ہیں۔ عارف شیرازی کہتے ہیں:

فکر خودورائے خود درعالم رندی نیست　　کفرست دریں مذہب خود بینی وخودرائی(۲)

وہ تو اس کو کفر فرماتے ہیں۔ لیکن اس سے وحشت نہ ہونا چاہیے کیونکہ کفر کے بھی مراتب ہیں۔ یہ کفر دون کفر(۳) ہے۔

اور سبب کلی اس خودرائی کا یہ ہے کہ ہم لوگوں میں اصلاح اخلاق کی کمی ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں۔ ورنہ بزرگوں نے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بغیر مشورہ نہیں کیا۔

اور سبب جزئی یہ ہے کہ ہم لوگ ہوش سے کام نہیں لیتے ہیں، نرے جوش سے کام لیتے ہیں۔ پس جوش میں مشورہ کا بھی تو ہوش نہیں رہتا اور جوش بھی فی نفسہٖ بری چیز نہیں جوش ہو مگر ہوش کے تابع ہو۔ جب آپ ہوش سے کام لیں گے تو اس کو بھی سمجھیں گے کہ آپ لوگ مقتداء بننے والے ہیں۔ اس لیے آپ کے اندر سب شعبے دین کے ہونا چاہئیں۔ اگر کسی بات کی کمی ہو تو نقصان ہے۔ حسین وہ ہے جس کے آنکھ کان، ناک سب اچھی ہوں، سب چیزیں موزوں ہوں۔ اگر سب چیزیں تو اچھی ہوں مگر

---

(۱) "جب بھوکا ہوتا ہے کتا بن جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو سخت اور ظالم بن جاتا ہے" (۲) "اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں، اس راہ میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے" (۳) یہ کسی اعتبار سے کم درجے کا کفر ہے

آنکھوں سے اندھا ہو، وہ حسین نہیں، یا ناک کٹا ہوا ہو تو وہ بھی حسین نہیں۔ اسی طرح دیندار وہ ہے جو دین کے تمام شعبوں کا جامع ہو۔ عالم وہ ہے جو تمام شعب علوم کا جامع ہو۔ ان ہی شعبوں میں سے امر بالمعروف کے وہ آداب بھی ہیں جو بتلائے گئے ہیں۔ ان سب کو جمع کرنا چاہیے۔ بحمداللہ ضرورت کے موافق بیان ہو گیا ہے۔

باطل کے مقابلہ میں تبلیغ

اسی بیان کا ایک تتمہ یہ بھی ہے کہ اہل اضلال (۱) میں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں۔ اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں اور وہ دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ یہ فرقہ زیادہ مضر ہے یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں، وہ مرزائیوں کا گروہ ہے۔ ان پر کفر وارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔ مبلغین کو ان دونوں کی مدافعت کرنی چاہیئے جیسے، آریہ ہیں ایسے ہی یہ ناریہ بھی ہیں۔ دونوں کافر ہیں۔

یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ پہلے شعبان میں کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا۔ اس کا نام دعوت الی اللہ ہے، وہ چھپ بھی گیا ہے۔ میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہیے اور آپس میں جو فرقے ہیں، جیسے رضائی یا مرزائی، ان سے لڑنا نہ چاہیے۔ یعنی جب وہ لوگ یعنی نومسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہل باطل سمجھتے ہیں، پھر ہم کدھر جائیں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ خیال میرا صحیح نہیں ہے پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ بھی صرف توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ کی۔ اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ یہ سنانا تھا کہ وہ ان سے الجھتے ہیں۔ تو اس وقت یہ رائے دی

(۱) گمراہ کرنے والے دو قسم کے ہیں۔

تھی کہ آپس میں نہ لڑو، اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشان ہوں گے، اسلام سے رک جاویں گے، اسلام سے متوحش ہوں گے۔ پہلے ان کو کسی کے ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو۔ جب وہ مسلمان ہوجاویں گے پھر بتلادینا کہ یہ مذہب باطل ہے اور یہ حق ہے اوراسی دعوت الی اللہ میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ جب تک ہے کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں، نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں اور اگر وہ اس سے تعرض کریں تو تم بھی دریغ نہ کرو۔

اب ایک دوست نے لکھا ہے کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے تو لازم آتا ہے کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہوکر اسلام کی اشاعت کریں اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی کہ اب شائع کردو کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں تو ہم بھی ان سے ضرور تعرض کریں گے۔

ردمرزائیت کی ضرورت

پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا کہ اب وہ تعرض نہ بھی کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہیے۔ کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں، مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو تو یہ خیال ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں۔تو پھر تو چندے(1) وہ انہی کو اپنے مقتداء اور پیر خیال کریں گے۔ پھر اس سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ کہ بے شک میرا خیال غلط تھا۔ پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغین کو کیا کرنا چاہیے۔ ان سے تعرض کرنے میں تو ضرر یہ تھا کہ کہیں دعوت ہی نہ رک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں ہی کے مناظرہ میں سارا وقت صرف نہ ہوجائے۔

اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کے ہاتھ پر چاہیں اسلام لے آئیں، چاہیں ہمارے ہاتھ یا مرزائیوں کے تو بعد اسلام لانے کے بعض نومسلموں پر ان کا اثر ہوجاوے گا، پھر ہٹانا مشکل ہوگا۔

(1) کچھ عرصہ بعد۔

اس لیے مشورہ کیا گیا۔ غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر اب نہ روکا جائے تو انجام میں اثر اچھا نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ مسلم پریشان ہوں گے کہ ہم کدھر جائیں۔ تو مشورہ پر بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے۔ تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی تو دعوت ہے اس کو کیوں ترک کریں، مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں، ہمارا کام دعوت ہے خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو اس کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔

ثمرہ تبلیغ

اور اب یہاں آن کر بھی معلوم ہوا کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جاوے اور اسی کو تو فرماتے ہیں: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ[1] اور وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ[2]

چنانچہ حضور کا بعض دفعہ جی چاہتا ہے کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے جو کفار چاہتے ہیں۔ تو اس کا کیا عجیب وغریب جواب ملا۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔[3]

پوری آیت کا مطلب تو ظاہر ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔[4] کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ بظاہر ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے ایسا سخت لفظ فرمایا ہے۔ یہ شبہ اصل میں غلط محاورہ سے ہوا ہے۔ ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اسی کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے، جاہل کا ترجمہ نادان ہے۔ یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے توہین لازم نہیں آتی۔ بلکہ شفقت کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی کہتے ہیں۔ دیکھو میاں نادان

(۱)''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ سے گم ہوا اور وہی راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے'' (۲) ''حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بغیر اللہ کے حکم کے ممکن نہیں'' سورۃ یونس:۱۰۰ (۳) ''اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا اعراض کرنا گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا سو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیے'' سورۃ الانعام:۳۵ (۴) ''پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نادانوں میں سے نہ ہو جائیے''۔

ایسی باتیں نہ کرو، دیکھو بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تو دیکھئے ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے۔ یہ اشکالات غلط محاورہ سے ہوتے ہیں۔

ترجمہ قرآن کریم میں احتیاط

چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا۔ اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کا ترجمہ کردو پھر اشکال کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے۔

منشاء اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بس شبہ یہ تھا کہ اس میں حضور کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف، پس واقف بنادیا۔ اب وہ میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا میاں بتاؤ کیا اشکال تھا؟ کہنے لگ اب تو کچھ بھی نہیں۔

اس جگہ راز یہ ہے کہ ضلالۃ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے۔ ایک مذموم میں، یعنی ولا الضالین میں جو ضال کہا گیا ہے وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے۔ یعنی جو بعد وضوح حق بھی(۱) اتباع حق نہ کرے اور ایک غیر مذموم ہے(۲) یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا(۳)۔ اس کے معنی ناواقفی کے ہیں۔ جو نقص نہیں، کیوں کہ حضور پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے۔ جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴) یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۵) میں یہی درجہ مراد ہے، کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق نہیں ہوا تھا۔ جب ہم نے وحی نازل کر کے حقائق کو واضح کردیا(۶) اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوح حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوح حق بھی کجی اختیار کی(۷)۔ تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں، اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے، اسی لحاظ سے بعض مترجموں نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر

---

(۱) حق واضح ہونے کے بعد بھی (۲) برا نہیں ہے (۳) حق واضح نہیں ہوا (۴) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نزول وحی سے پہلے) معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کے بارے میں علم تھا'' سورۃ الشوریٰ: ۵۲ (۵) ''اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (شریعت سے) بے خبر پایا اور (شریعت کا راستہ بتلایا)'' (۶) پہلے آپ پر حق واضح نہیں تھا اب ہم نے بذریعہ وحی حق واضح کردیا (۷) حق واضح ہوجانے کے بعد بے راہ روی اختیار کی۔

اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں مستعمل ہوتا ہے اس لیے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے جس سے عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ کیجئے۔ اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا، بلکہ پیار کا لفظ ہے، دیکھو اگر تم کسی کو کہو کہ او مرغی کے بچے! تو وہ بھڑک اٹھتا ہے، غضب ناک ہوتا ہے، گویا آگ لگا دی اور اگر کہو او چوزے! تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور کا جی چاہتا تھا کہ کفار کو وہی معجزہ دکھلا دیا جاوے۔ جس کو وہ چاہتے ہیں، اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے دیا: فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ(۱)

حاصل آیت کا یہ ہے کہ ہم تو ایسا معجزہ نہیں دکھلاتے۔ اگر آپ کا جی چاہتا ہے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر لے آیئے ہم بھی دیکھیں کہ آپ کہاں سے لائیں گے۔ کس قدر خشک اور مایوس کن جواب ہے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کام کرنے والے کو ثمرہ عاجلہ پر نظر نہ ہونی چاہیے اور اس کے عدم ترتب سے محزون نہ ہونا چاہیے اور ایک تو طبعی حزن ہوتا ہے، اس میں تو آدمی معذور ہے، بلکہ ماجور ہے(۲) اور ایک مبالغہ فی الحزن(۳) ہے یعنی یہ سوچ سوچ کر محزون ہونا اس کی اجازت نہیں۔

دعوت وتبلیغ کا طریق

میں ان دونوں کے جمع کا طریق بیان کرتا ہوں، وہ یہ کہ سعی میں نیت فقط رضائے خدا کی ہو، یہ نیت ہی نہ ہو کہ وہ مسلمان ہی ہو جائے۔ ہاں دعا کرتا رہے کہ یا اللہ اس کو مسلمان بنا دیجئے اور اس کے دل کے اندر اپنا خوف پیدا کر دیجئے۔ دعا تو یہ کرے اور عمل وہ کرے کہ اپنے کام میں رضائے حق کو مدنظر رکھے۔ اپنا کام صرف تبلیغ کو سمجھے۔ خواہ ثمرہ مرتب ہو یا نہ ہو۔ وہ خدا کے اختیار میں ہے اور اگر کسی کے ذہن میں اور

(۱) ''اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈیں'' (۳) اس پر اجر کا مستحق ہوگا (۴) غم میں زیادتی۔

کوئی صورت جمع کی ہو تو مطلع فرمادیں (اہل مجلس کی طرف سے جواب آیا کہ یہ بالکل صحیح ہے) ذوق گواہی دیتا ہے کہ یہ طرز کافی شافی ہے۔ اس سے تکلیف بھی نہیں ہوگی حزن وملال بھی نہ ہوگا اور چونکہ دعا میں عرض ومعروض ثمرہ (۱) ہی کے متعلق ہوگی۔ تو اس میں یہ نیت بھی ایک درجہ میں ہوجاوے گی کہ ثمرہ مرتب ہو بس اتنی نیت کافی ہے ثمرہ مرتب ہونے کے لیے، اس سے زیادہ مناسب نہیں۔ اور نیت بھی ایسے طریقہ سے ہے کہ حق تعالیٰ سے عرض حاجت کی ہے امید ہے کہ وہ پوری ہوگی۔ قلوب ان کے ہاتھ میں ہیں۔ ان شاء اللہ وہ قلوب کو پھیر دیں گے اور اگر اس دعا کے بعد بھی کامیابی نہ ہو، بلا سے نہ ہو، تم اس کی پرواہ مت کرو، نیز دعا میں بھی یہ قصد نہ کرو کہ یہ ثمرہ ضرور مرتب ہو ہی جاوے۔

دعا کرنے کا ادب

اگر کوئی کہے کہ یہ تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کرنا کہ مقصود پورا ہو ہی جاوے، یہ دعا میں محمود ہے۔ حدیث: ان اللّٰہ یحب الملحین فی الدعاء(۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے اندر یہ قصد ہونا چاہیے، نیز ادعوا اللّٰہ وانتم موقنون بالاجابۃ (۳) اور تم اس سے منع کرتے ہو؟ تو یہ بات ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دعا میں عزم تو یہی ہو کہ یہ مقصود پورا ہوجائے مگر اس کے ساتھ دوسری شق پر بھی رضا ہے۔ یعنی دعا تو اسی نیت سے کرلے کہ مراد پوری ہو ہی جائے۔ لیکن یہ بھی دل میں رکھے کہ اگر نہ ہو تو اس پر بھی راضی اور خوش رہوں گا۔ مثلاً تندرستی کے لیے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ ہمیں تندرست کردے۔ تو یہ نیت نہ کرے کہ اگر آپ کا جی چاہے تو کردیجئے اور مرضی نہ ہو تو نہ کیجئے۔ اس لیے دعا کے اندر ان شئت کہنے کی ممانعت ہے۔

حدیث میں ہے کہ ان شئت مت کہو۔ کیونکہ ان کو مجبور کرنے والا کون ہے۔ وہ خود ہی جو مناسب ہوگا کریں گے، جو تمہارے لیے بہتر ہوگا وہی تجویز کریں گے تم اپنی طرف سے یہی عرض کرو کہ میری مراد پوری ہوجاوے۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ جس چیز

(۱) دعاء میں اللہ سے اس پر ثمرہ مرتب ہونے ہی کی درخواست ہوگی (۲) ''اللہ تعالیٰ دعا میں مبالغہ کرنے والے کو پسند کرتے ہیں'' فتح الباری لابن حجر: ۱۱/ ۹۵ (۳) '' اللہ سے مانگو قبولیت دعا پر یقین رکھتے ہوئے'' سنن الترمذی: ۹/ ۳۴۷۔

کی دعا کرنی ہے وہ شریعت کے موافق ہو اور اس کے موافق سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی ہوجاوے تو عفو ہے[۱]۔ مثلاً جس چیز کی دعا کرتا ہے یہ اس کو قواعد سے شریعت کے موافق سمجھا تھا اور واقع میں شریعت کے مخالف تھی تو اس پر دارو گیر نہ ہوگی۔ غرض مراد تو شریعت کے موافق ہونا چاہیے خواہ واقع میں یا اس کے اجتہاد میں۔ مگر دعا تردد کے ساتھ نہ کرے جزم کے ساتھ کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سمجھے کہ اگر قبول نہ ہو تو بھی میں راضی رہوں گا اور میرے لیے وہی بہتر ہوگا اور اسی میں خیریت ہوگی تو اس قضیہ ذہنیہ سے اس غیر معلقہ ملفوظ کی تعدیل ہوجائے گی۔ جب حقیقت دعا کی سمجھ میں آئے گی تو اب شبہ رفع ہوگیا اور جزم بالدعاء وعدم قصد ثمرہ[۲] میں تعارض نہیں رہا۔

مقصود تبلیغ

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود سعی سے رضائے حق ہے[۳] نہ کہ ثمرہ۔ اور اس کے ساتھ ہی ثمرہ کے لیے دعا کی بھی اجازت ہے۔ مگر مبالغہ کے ساتھ اس کے پیچھے مت پڑو کہ ہو ہی جائے اور نہ ہو تو رنج کرنے بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ فَاَنۡتَ لَهٗ تَصَدّٰى (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی فکر میں پڑتے ہیں) اور لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ (آپ ﷺ ان پر مسلط نہیں ہیں) میں اسی کی تعلیم ہے۔ کہ آپ تبلیغ کرنے کے زیادہ پیچھے نہ پڑیئے، وہ قبول کریں یا نہ کریں، اس سے بحث نہ ہونا چاہیے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ آپ کا کام رضائے حق حاصل کرنا ہے نہ کہ ثمرات، کہ وہ نہ اختیاری ہیں نہ موعودہ[۴] اسی لیے ہم کو کسی کے مسلمان بنانے کا حکم نہیں۔ کیونکہ وہ دوسرے کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے۔ قادر بقدرت الغیر[۵] کیسے قادر ہوسکتا ہے۔ اختیار تو دوسروں کا ہے اور اس سے کام لیں آپ، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

ثمرات پر نظر ہونے کا نقصان

اس لیے ایسے امور کے مستعدی ہونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بالخصوص سالکین کو، ان کی تو ثمرات عاجلہ[۶] پر نظر کرنے سے گویا موت آجاتی ہے۔ کیونکہ اہل

(۱) معاف ہے (۲) مقصود متعین کرکے دعا مانگنے اور اس پر ثمرہ مرتب نہ ہونے میں کوئی تعارض نہیں (۳) کوشش کرنے سے مطلوب رضائے الٰہی ہے (۴) نہ ان کا وعدہ (۵) جو کسی فعل پر غیر کی وجہ سے قادر ہو وہ قادر نہیں (۶) فوری ثمرات مرتب ہونے پر نظر۔

علم کو ثمرہ مرتب نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ نہیں ہوتا اور سالکین کو ثمرہ عمل حاصل نہ ہونے سے بدحالی کا شبہ ہوجاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم کو ذوق شوق ہو، گریہ طاری ہو(۱)، میلان الی المعاصی نہ ہو(۲)، معصیت کا وسوسہ(۳) بھی نہ ہو، ہر وقت محویت رہے۔ مگر انسان اس کا مکلف کب ہے(۴)۔ وہ تو صرف اس کا مکلف ہے(۵) اور اتنا ہی اس کے اختیار میں ہے کہ معاصی کا مرتکب نہ ہو(۶)۔ جوارح اور قلب کو گناہ(۷) سے پاک رکھے، نہ ہاتھ سے گناہ کرے، نہ پیر سے، نہ زبان اور دل کو معاصی(۸) میں مبتلا کرے، خلاصہ یہ کہ تقاضائے معصیت پر عمل نہ کرے۔

گناہ کا وسوسہ آنا نقصان دہ نہیں

اگر تقاضے پر عمل نہ ہو تو پھر خواہ کتنا ہی میلان ہو(۹) واللہ ذرہ برابر بھی نقص نہیں بلکہ ماجور ہے(۱۰) کیونکہ اس وقت مشقت زیادہ ہوتی ہے، نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے، بار بار تقاضا ہوتا ہے اور وہ اس کو روکتا ہے اور جو شخص یوں چاہتا ہے کہ میلان ہی نہ ہو۔ اول تو یہ اختیار میں نہیں، اس کا قصد بے معنی، پھر اگر ایسا کیا تو حقیقت میں وہ طالب حق نہیں۔ طالب راحت ہے پس اس میں تاکید نفس ہے کہ مشقت سے بھاگنا چاہتا ہے، مجاہدہ سے اکتاتا ہے پس میلان الی المعاصی کوئی نقصان کی بات نہیں، یہ تھوڑا بہت سب کو ہوتا ہے، حتیٰ کہ کاملین کو بھی ہوتا ہے۔ ہاں کسی کا نفس ایسا مطمئنہ ہوجائے کہ گناہ کا خطرہ(۱۱) ہی نہ گزرے۔ یہ اور بات ہے مگر یہ نادر ہے۔ غرض خطرات کا آنا کوئی مضر چیز نہیں۔ پس اس غم میں نہ پڑنا چاہیے گو غم میں پڑ جانا بھی فی نفسہٖ مضر دین نہیں۔ لیکن اس سے کلفت تو ہوتی ہے اور اس کلفت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی بیماری لگ جاتی ہے۔ پھر دین کے کاموں میں خلل پڑنے لگتا ہے:

(۱) رونا آئے (۲) گناہوں کی طرف طبیعت مائل نہ ہو (۳) گناہ کا خیال بھی نہ آئے (۴) انسان کو اس کا پابند ہی نہیں کیا گیا (۵) پابند (۶) گناہ کا ارتکاب نہ کرے (۷) اعضاء اور دل (۸) گناہوں میں (۹) طبیعت کتنی ہی مائل ہو (۱۰) اس پر ثواب کا مستحق ہوگا (۱۱) گناہ کرنے کا خیال۔

غلو مجاہدہ کا نقصان

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی کی خدمت میں ایک شخص حاضر تھے، جو مجاہدہ بہت کرتے تھے، کھانا بہت کم کھاتے تھے اور اس سے ضعیف ہوگئے تھے۔ تو مولانا نے فرمایا کہ حدیث میں ہے: المؤمن القوی خیر من الضعیف وفی کل خیر (۱) یعنی اگر مومن تندرست طاقت ور ہے تو کسی کی کچھ خدمت کردے گا کہ کسی کے لیے پانی لادے گا۔ اور اگر ضعف آگیا تو بجائے خادم ہونے کے مخدوم بن جائے گا، دوسروں کا محتاج ہوگا کہ بھائی مجھے پانی پلادو، لاؤ وہ لادو، حتیٰ کہ بعض دفعہ نماز روزہ ادا کرنا بھی مشکل ہوجاوے گا۔ ہاں ضعف اضطراری الگ بات ہے، یہاں تو اختیاری کا ذکر ہے۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اسکے بعد ان کے معدہ میں خشکی پیدا ہوئی۔ اس سے کچھ الوان اور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ جن کو انہوں مولانا کی خدمت میں ظاہر کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ مقدمہ جنون ہے علاج کرو۔ مگر وہ اس کو بزرگی سمجھے ہوئے تھے۔ علاج نہ کیا آخر مجنون ہوگئے۔ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ برہنہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔ وظائف اور مجاہدہ تو الگ رہا۔ فرائض بھی چھوٹ گئے، اس سے کیا نفع ہوا۔ غرض امور غیر اختیاریہ کے درپے ہونے سے بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے بیمار ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات مرجاتا ہے۔ بعض لوگ خودکشی کرلیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں ایک طالب علم نے ایک حکایت بیان کی تھی کہ رام پور میں ایک شخص تھے، ان کو ایسا ہی قبض طاری ہوا، ساری کیفیات جاتی رہیں۔ وہ سمجھے کہ میں مردود ہوگیا اور کوئی دستگیر ہادی (۲) ملا نہیں، آخر خودکشی کرلی۔ باقی یہ کہ اس سے مواخذہ ہوگا یا نہیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مقدمہ ہمارے پاس نہیں آوے گا۔ خدا جانتا ہے کہ وہ مغلوب الحال تھے یا نہیں، مگر نقصان تو ہوا۔

عبدیت کا تقاضا

اور اس میں ایک باریک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ ہماری

(۱) الصحیح لمسلم، القدر: ۳۴ (۲) ہاتھ تھامنے والا راہنما۔

حالت ایسی ہو، ایسی ہو، یہ شخص اپنے لیے خود تجویز کرتا ہے جو کہ خلاف عبدیت اور بے ادبی اور گستاخی ہے تمہیں کیا حق ہے تجویز کرنے کا۔تمہاری تو یہ حالت ہونا چاہیے:

چوں کہ برمیخت بہ بندوبستہ باش چوں کشاید چابک وبرجستہ باش(۱)

چنانچہ ایک حکایت ہے حاجی صاحبؒ کی اس سے آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہوگی کہ ایک طالب علم آپ کے پاس آیا اور مرض کی شکایت کی کہ اتنے دنوں بیمار رہا۔ اس مدت میں حرم شریف میں نماز پڑھنا بھی نصیب نہ ہوئی۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحت وقوت بخشے۔ اس وقت حضرت نے اس کے لیے دعا کی جب وہ چلا گیا تو فرمایا یہ شخص عارف نہیں ہے۔اگر عارف ہوتا تو نماز حرم کی غیر حاضری سے مغموم نہ ہوتا کیونکہ مقصود اصلی تو قرب ہے جس طرح بھی حاصل ہو اس کا طریقہ مختلف ہے۔ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بیمار ہوجائے اور اس پر صبر کرے۔شکوہ شکایت نہ کرے اور اس سے قرب ہو تو مقصود جس طریقہ سے بھی حاصل ہو اس پر راضی رہنا چاہیے۔حصول مقصود کے بعد کسی طریقہ کے فوت پر حسرت کرنا مقصود کی بے قدری ہے۔

حصول مقصود

اور اس کی ایک مثال بیان فرمائی کہ دیکھو لوگ جو حج کرنے آتے ہیں تو مقصود کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود حضوری بیت اللہ ہے۔کوئی خاص راستہ مقصود نہیں کہ مثلاً بمبئی ہی ہو کر آوے۔ اب ایک شخص تو بمبئی ہو کر آیا، اس کو بہت سے حالات راستہ کے معلوم ہوئے۔ اور ایک کراچی ہو کر آیا جس کو وہ خاص حالات معلوم نہ ہوئے اب کوئی بے وقوف ہی ایسا ہوگا جو حج کو چھوڑ کر کراچی سے بمبئی آوے تا کہ یہ حالات معلوم ہوں۔ صوفیا نے لکھا ہے طرق الوصول الی اللّٰہ بعددِ انفاس الخلائق(۲)۔کسی کے لیے کوئی طریقہ ہے کسی کے لیے کوئی طریقہ ہے، کوئی طریقہ مقصود نہیں، مقصود رضا ہے۔ جب رضا حاصل ہے تو اب تمنا کرنا کہ یہ ہو وہ ہو یہ تجویز ہے جو ادب طریقہ کے خلاف ہے۔

(۱) ''جب وہ باندھ دیں تو بندھے رہو اور جب کھول دے تو کھل جاؤ اور خوشی سے کودنے لگو'' (۲) وصول الی اللہ کے طریقے انسانوں کے وجود کے بقدر ہیں۔

فنائے ارادہ

صوفیاء تو اپنے ارادہ کو ایسا مٹاتے ہیں کہ یہاں تک کہتے ہیں:

اريد وصاله ويريد هجري فاترك ما اريد لمايريد(۱)

اور حافظ شیرازی نے اسی کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

میل من سوئے وصال ومیل اوسوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست (۲)

پس عبدیت یہ ہے کہ اپنی خواہش کو فنا کر دے جو ان کا ارادہ ہے اسی پر راضی رہے۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے: ارید لا ارید واختار ان لا اختار (۳) اس پر ابن عطا اسکندری نے ایک اشکال وارد کرکے خود جواب دیا ہے، اشکال یہ ہے کہ عدم ارادہ کا ارادہ یہ بھی تو ایک ارادہ ہوا، پھر ارادہ کا فنا کہاں ہوا، کسی معقولی کا اشکال معلوم ہوتا ہے۔ پھر خود جواب دیا ہے کہ مغلوب مطلق ارادہ کا فنا کرنا نہیں بلکہ صرف ارادہ کا جو کہ رضا کے خلاف ہو اور عدم ارادہ کا ارادہ رضا کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خداوند کریم بھی چاہتے ہیں کہ بندہ کسی ایسی بات کا ارادہ نہ کرے جو رضا کے خلاف ہو۔ پس عدم ارادہ کا ارادہ فناء ارادہ کے منافی نہ ہوا۔

خلاصہ کلام

خلاصہ یہ کہ اعمال اختیاریہ میں کمی کرے اور ثمرات غیر اختیاریہ میں تفویض کرے۔ اس قدر ان کے درپے نہ ہو کہ فقد ان پر غم کرنے لگے۔ البتہ جو ان میں محمود ہیں ان کے لیے دعا کا مضائقہ نہیں، پھر حاصل ہوں تب، نہ حاصل ہوں تب، دونوں حال میں راضی رہو اور اختیاری اعمال میں لگے رہو۔ کیونکہ غم تو جب ہوتا ہے جب ان ثمرات کا وعدہ ہوتا ہے یہ وعدہ کہاں ہے کہ ذوق وشوق بھی عطا کروں گا، ہاں حدیث میں اس کی دعا آئی ہے۔ تو ذوق وشوق کے واسطے دعا کرو۔ اس سے کام میں سہولت ضرور ہوتی ہے۔ اس لیے اپنے اہل طریق نے کہا ہے کہ یہ احوال مقصود نہیں ہیں۔ ہاں

(۱)''میں اس سے ملاقات کا متمنی ہوں وہ مجھ سے جدائی کا خواہاں ہے میں نے اس کے ارادہ پر اپنا ارادہ مٹا دیا'' (۲)''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور اس کی خواہش میری جدائی ہے میں نے اپنی تمنا چھوڑ دی تا کہ میرے دوست کی تمنا پوری ہو جائے'' (۳)''میں عدم ارادہ کا ارادہ کرتا ہوں اور عدم اختیار کو اختیار کرتا ہوں''۔

محمود ہیں جب محمود ہیں تو دعا کرلو اور جب مقصود نہیں اس کے فقدان سے پریشان نہ ہو ان کا انتظار کرو جیسے مقولہ مشہور ہے:

الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی (۱)

ایسے امور غیر اختیاریہ وغیرہ موجودہ کے متعلق حضرت حاجی صاحب سے کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ یہ تھوڑا نفع ہے کہ خدا نے تم کو اپنا نام لینے کی توفیق دی اور اکثر یہ شعر پڑھتے۔

یا بم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم ۔۔۔ حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم (۲)

یہاں ایک علمی اشکال ہے وہ یہ کہ یافتن حق تو نصاً (۳) مطلوب ہے اور اسی کے پانے کے لیے تو رات دن مستانہ وار پھرتے ہیں۔ پھر نہ یافتن پر رضا؟ جواب یہ ہے کہ قائل کی اصطلاح نہ جاننے سے یہ اشکال وارد ہوا۔ ہر فن کی اصطلاح جدا ہے۔ عشاق کی اصطلاح الگ ہے۔ علماء کی جدا اصطلاح ہے تو ہر متکلم کی اول اصطلاح جاننا چاہیے۔ یہاں یافتن حق سے مراد یافتن حقیقی نہیں یافتن مرغوب ہے جو اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھا ہے کہ اگر یہ بات حاصل ہو جو میرے ذہن میں ہے تب تو یافتن متحقق ہوا ورنہ نہیں ہوا۔ تو اس کو فرمارہے کہ یہ خواہ حاصل ہو یا نہ ہو اس کو چھوڑو اور اپنا کام کئے جاؤ۔ اسی کو عارف شیرازی دوسرے صاف عنوان سے فرماتے ہیں:

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب ۔۔۔ کہ حیف باشد از وغیرہ اوتمنائے (۴)

فراق اور وصل دونوں کی نفی کر کے رضا کو مطلوب فرماتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال حقیقی مراد نہیں وہ تو عین رضا ہے، نہ کہ مقابل رضا کا۔ اسی طرح فراق حقیقی مراد نہیں وہ تو منافی رضا کا ہے نہ کہ ممکن الاجتماع رضا کے ساتھ بلکہ وصال و فراق مزعوم یعنی تم جس کو فراق یا وصل سمجھے ہوئے ہو اس کا کچھ اعتبار نہیں تم اپنی نظر رضا پر رکھو۔ باقی حقیقی وصال اور رضا تو ملازم کا علاقہ ہے۔ یعنی رضا مستلزم ہے وصال کو یا یوں

(۱) ''جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لے پھر وحی کا انتظار کرتا ہے'' (۲) ''میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں میں اس کی جستجو کرتا ہوں مجھے یہ ملے یا نہ ملے اس کی آرزو کرتا ہوں'' (۳) حق کی تلاش تو مطلوب ہے (۴) ''فراق ووصل کیا ہوئے رضائے الٰہی طلب کرو اس لیے کہ اس کے سوا کوئی طلب باعث صد افسوس ہے''۔

کہو کہ وصال مستلزم ہے رضا کو۔ وصال میسر ہو تب بھی مطلوب حاصل، رضا میسر ہو جب بھی مدعا حاصل۔ اسی کو کہتے ہیں کہ:

بخت اگر مدد کند دامنش آدرم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف (۱)

یعنی خواہ یہ لازم ہو اس کو یا وہ لازم ہو اس کو، دونوں طرح مطلب حاصل ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وصال بلا رضا ہو جائے۔ جب یہ ہے تو پھر اس کے کوئی معنی ہی نہیں کہ رضا کو طلب کرو اور وصال کے طالب مت بنو۔ تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ وصال دو قسم پر ہے ایک وصال مزعوم اور ایک واقعی (۲) نفی وصال مزعوم کی ہے اور طلب وصال واقعی کی (۳)۔

حقیقت قبض و بسط

اب میں اس کے مصداق کی تعیین کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس غلطی میں سالکین بکثرت مبتلا ہیں۔ وہ وصال مزعوم بسط ہے اور فراق مزعوم قبض ہے جب قبض ہوتا ہے تو سالک کو بڑی تنگی ہوتی ہے اور اس کو یہ متوہم ہوتا ہے کہ میں مردود ہو گیا اور یہ کم و بیش سب کو پیش آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ تو فراق سے یہ قبض مراد ہے اور وصل سے اس کا مقابل بسط اور یہاں قبض و بسط اصطلاحی مراد ہے نہ کہ لغوی۔ یعنی واردات واحوال کا فیضان وفقدان۔

پس عارف شیرازی اس کے متعلق تسلی فرماتے ہیں کہ قبض و بسط کیا چیز ہے جس کو تم فراق و وصل سمجھ رہے ہو اور اس کے پیچھے پڑے ہو تمہارا کام تحصیل رضائے حق ہے۔ اسی کے طالب بنو اور یہی معنی ہیں۔ یا بم اورا یا نہ یا بم کے۔ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جستجو میکنم کے بعد نیابم کا احتمال رہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے:

من تقرب الیّ شبرا تقربت الیہ ذراعا الحدیث (۴)

---

(۱) بخت اگر مدد کرے تو میں اس کا دامن پکڑلوں اگر وہ مجھے اپنی طرف کھینچ لے تو باعث صد مسرت ہے اور اگر میں اس کو اپنی طرف کھینچ لوں تب بھی باعث صد خوشی ہے'' (۲) وصال کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کو یہ اپنے گمان میں وصال سمجھا ہوا ہے اور ایک واقعی (۳) وصال مزعوم کی ممانعت اور وصال حقیقی کی طلب ضروری ہے (۴) ''جس نے میری طرف ایک بالشت قرب حاصل کیا میں اس کی طرف ایک ہاتھ قرب کے لیے آگے ہوتا ہوں'' مسند أحمد: ۲/ ۴۱۳،۳/ ۴۰۔

خلاصہ تصوف

خلاصہ یہ ہوا کہ صوفیاء کے نزدیک تسلیم ورضا روح سلوک ہے (۱) اور جتنے عقبات (۲) اس طریق میں پیش آتے ہیں اس میں بڑے حصہ کا حل یہی رضا ہے اور اسی کا تتمہ یہ ہے کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے (۳) یہ دونوں باتیں اگر سمجھ میں آجائیں تو پھر کبھی پریشانی نہ ہوگی اور میں نے صوفیاء کا یہ قول کہ ثمرات کا مرتکب ہونا مقصود نہیں ہے مقصود رضا ہے، اپنے مضمون کی تائید میں پیش کردیا۔ ورنہ یہ مضمون قرآن کی آیات میں موجود ہے۔ کہ تبلیغ میں ثمرہ مقصود نہیں۔ اصل مقصود رضا ہے (۴) جس کا طریق عمل وسعی ہے (۵)۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کجی سے بچاوے اور فہم سلیم وتوفیق عمل عطا فرماوے۔ (۶) آمین (۷)

وصلی اللّٰہ تعالی وسلم علی خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلی اٰلہٖ واصحابہ اجمعین۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

---

(۱) ہر حال پر راضی رہنا راہ سلوک کی روح ہے (۲) دشوار گزار گھاٹیاں (۳) ہر حال پر راضی رہے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو (۴) تبلیغ پر نتیجہ مرتب ہی ہو کہ وہ مسلمان ہوجائے یہ مقصود ہی نہیں اصل مقصود اللہ کی رضاء ہے (۵) جس کا طریقہ عمل کرنا اور کوشش کرنا ہے (۶) اللہ تعالیٰ فہم سلیم عطا فرمائے اور بے راہ روی سے بچائے (۷) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی
۲۰/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ
۳۰/۱۰/۲۰۱۸

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی

ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاہور

۱۔ مورخہ 3 دسمبر 2018ء کو جامعہ کے بہت ہی محترم اور قریبی متعلق جناب انجینئر عبدالمنان صاحب (خلیفہ مجاز حضرت مولانا فقیر محمد صاحبؒ) مکہ مکرمہ سے تشریف لائے اور جامعہ کا دورہ کیا، حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے بنائے ہوئے نظم کو خوب سراہا اور ادارے کی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ادارے کو اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

۲۔ 15 دسمبر 2018ء کو برونائی دار السلام سے جناب فضیلۃ الشیخ الدکتور مصطفی رزق السواحلي جامعہ تشریف لائے اور حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے حضرت کو جامعہ کا مکمل دورہ کروایا۔ جامعہ کے نظم ونسق کو سراہتے ہوئے جامعہ کی تعلیمی و تصنیفی خدمات پر بے حد مسرت و اطمینان کا اظہار کیا کہ پاکستان میں ایسے عمدہ طرز پر دین کی خدمت جاری ہے۔ اللہ رب العزت اس ادارے کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے اور متعلقین ومعاونین کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت فرمائے۔

۳۔ مورخہ 6 جنوری 2019ء کو حضرت قاری احمد میاں تھانوی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خصوصی دعوت پر عمان سے جامعہ سلطان القابوس کے کلیۃ الحقوق کے عمید فضیلۃ الشیخ الدکتور عبد اللہ بن مبارك العبري تشریف لائے اور جامعہ کا مکمل دورہ کیا، طلباء واساتذہ سے خطاب بھی فرمایا۔ ادارہ اشرف التحقیق کی تحقیقی و تصنیفی خدمات کا جائزہ لیا اور بہت پسند کیا۔ پروگرام کے اختتام پر روزنامہ اوصاف کے نمائندوں نے حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم العالیہ سے دین کی سربلندی اور عصری ودینی علوم کے باہم امتزاج پر گفتگو کی اور جامعہ کے نظم کو مثالی قرار دیا۔

۴۔ موجودہ دور میں دینی مدارس کے نا مساعد حالات کے باوجود الحمدللہ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے اور جامعہ کو اہل علاقہ کا بھرپور تعاون حاصل ہے جس پر جامعہ کی انتظامیہ تمام معاونین کی بے حد مشکور ہے۔ آئندہ کے لئے دعاؤں کی درخواست ہے۔